جلوہ گاہ

جلوہ گاہ

مخمور جالندھری

قیمت ۱عہ

2/

طبع اول
۱۹۴۲

طبع دوم
۱۹۴۳

گوربخش سنگھ نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے چھپوا کر جالندھر چھاؤنی سے شائع کی

فہرس

بھوکی جوانیوں کے نام ——

پیش لفظ

مجھے اعتراف ہے کہ جلوہ گاہ کی پہلی اشاعت افراط و تفریط سے لبریز تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر نظم اچھی نہیں ہوا کرتی مگر اپنی ذہنی کاوشوں کو رائیگاں جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا جاتا۔ شاعر اس معاملے میں بہت مجبور ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یُوں بھی ہوتا ہے کہ وقت گذرنے پر شاعر کو اپنی اچھی سے اچھّی کاوش میں بھی کوئی حُسن نظر نہیں آتا اور جب تک یہ خیال شاعر کے ذہن میں موجود رہتا ہے وہ ارتقا کی منازل سرعت کے ساتھ طے کرتا رہتا ہے۔ میں بھی جلوہ گاہ کی پہلی اشاعت سے مطمئن نہ تھا۔ پھر بھی وہ ایک سال کے قلیل عرصے میں ختم ہو گئی۔ پچیس نظموں کے اضافے اور پینتیس نظموں، چالیس غزلوں کی ترمیم کے ساتھ جلوہ گاہ کی اشاعتِ ثانی میری شاعری کے دَورِ اوّلیں کا مکمّل اور واضح آئینہ ہے۔

افراط و تفریط کے عیب کو دُور کرنے کی حتیّ الامکان کوشش کی ہے۔ ممکن ہے کہ میں اس کوشش میں ناکام رہا ہوں۔ لیکن مجھے اتنا اطمینان ضرور ہے کہ اس دفعہ کوئی ایسی نظم شامل نہیں ہو سکی جس میں کاوش و تجسّس کا اظہار نہ ہو۔

مدارجِ عمر کو انسان کی حیات میں بڑا دخل ہے۔ انسان بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے تاثرات کو زائل نہیں کر سکتا۔ یہ ایسے حقائق ہیں جو جھٹلائے نہیں جا سکتے۔ میں نے بھی جوانی میں وہی راگ الاپے ہیں جن کا عہدِ شباب اور میرا ماحول مقتضی تھا۔ شعر کی مکمّل اور جامع تعریف آجتک کوئی نہیں کر سکا۔ ہر گروہ کا اپنا اپنا کلیہ ہے جوانی کے ان رسیلے ترانوں میں مٹھاس ہی نہیں بلکہ ایک ناقابلِ انکار تلخی بھی موجود ہے۔ یہ حیاتِ انسانی کی جاذبِ نظر اور مکروہ تصویریں ہیں جنہیں جانے پہچانے چہرے جھلکتے ہوئے نظر آئینگے اور وہی ادب زندہ اور جاندار ہے جو بنی آدم کی اجتماعی زندگی کا بلند اور شاندار تجزیہ ہو۔ مجھے مسرت ہے کہ میرے ذہن نے بے بنیاد اور بے جان مجسمے نہیں تراشے۔

ہر ایک فن کار کا اسلوب جسے ہم اس کی انفرادیت کا نام دیتے ہیں جداگانہ ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ بعض بنیادی مسائل ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن انہی بنیادی مسائل میں سے بیشتر ایسے ہیں جنہیں دوام حاصل ہے۔ فراق و وصال غم و مسرت، افلاس و امارت، مرگ و حیات، یکرنگی و نیرنگی، نامرادی و کامرانی اور گناہ و تقدیس یہی وہ مستقل مسائل ہیں جن کی اساس پر ادب کی پُرشکوہ عمارت کھڑی ہے۔ اب رہی ہماری معاشرت، ہمارا تمدن، ہماری تہذیب یہ سب وقت کی رفتار سے ہم آہنگ ہیں۔ اس تمام نظامِ حیات کی وقت کی محشر خرامی کے ساتھ ہم آہنگی ہی جدّت، ایجاد و اختراع اور سعی و تجسّس کی خالق ہوا کرتی ہے۔

مَیں اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میرے ذہن کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ نظم کے ذریعے زندگی کا تار و پود بکھیر کر رکھدے۔ میری نظموں میں زندگی اپنی

تمام اچھی اور بُری صورتوں میں جلوہ گر نظر آئیگی۔ ہو سکتا ہے بعض مقامات پر رجعت پسند مذاقِ سلیم اپنی ناک سکوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر وہ زندگی کی ذرا سی جھلک ان نظموں میں دیکھ سکا تو میں سمجھونگا کہ میں اپنے فرض سے خوش اسلوبی کے ساتھ سبکدوش ہوا ہوں۔

رجعت پسندوں کو نئے ادب کی بیباکی سے شکایت ہے۔ جدید ادب پر عریانی اور فحش نگاری کا الزام لگانے والے یہ نہیں سوچتے کہ پند و نصائح بھی گناہ کی دلکشی کو کم نہیں کر سکے۔ تقدیس کے مقابلے میں گناہ آج بھی زیادہ مقبول ہے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں گناہ کا کثرت سے استعمال ہی نوعِ انساں کو تقدیس کا سبق دے سکتا ہے۔ ابھی دنیا عشرتِ گناہ سے سیر نہیں ہوئی جب ہم قوت و سرمایہ کو پھلتے پھولتے دیکھ سکتے ہیں جو گناہ کے سب سے بڑے خالق ہیں۔ جب ہم نکبت و افلاس کو مجبور ہو کر گناہ اختیار کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم گناہ کے اس ذکر سے گھبرا جاتے ہیں جس میں گناہ کو اس کی مکروہ ترین صورت میں دکھایا گیا ہو۔ گناہ کی اس کریہُ المنظری میں اصلاح ہے، تعمیر ہے، تخریب نہیں۔ کوئی اخلاق کے پُرانے اصولوں پر کب تک کاربند رہ سکتا ہے۔ ہمیں اخلاق کے نئے آداب وضع کرنے ہونگے۔

نئی شاعری ہمہ گیر و ہمہ رنگ ہے اور اسکی ہر دلعزیزی کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے کیونکہ اس میں تصنع اور پھیکے پن کا شائبہ بھی نہیں۔ جدید شاعری مغربی رجحانات کی آئینہ دار سہی مگر یہ قول مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، نہ آج تک بدلا ہے نہ آیندہ کبھی بدلے گا۔ یہ درست ہے کہ جدید نظم کی تکنیک اور ہیئت ہم

نے مغرب سے مستعار لی ہے لیکن ہماری نظموں کے کردار مشرقی طرزِ معاشرت کے مثالی آئینے ہیں۔ ہمارا ماحول بھی مشرقی ہے۔ مغرب آزاد اور حکمراں ہے۔ مشرق کا بیشتر حصہ غلام اور مجبور۔ خاص طور پر ہمارا ہندوستان دُنیا کا مظلوم ترین ملک ہے، یہاں عسرت و افلاس کا تعفّن، منصب و سرمایہ کا غیر ذمہ دارانہ تحکّم، عدل و انصاف کی رشوت ستانی، مجبوری و بیچارگی کی ضمیر فروشی، بھوک کی ذلّت اور شباب کی بے دست و پائی ایسے مسائل ہیں جنہیں حل کرلے کے بعد ہی اذہان و افکار زندگی کی خوش منظر تصویریں کھینچ سکتے ہیں۔

ایک بھوکے کے ذہن میں روٹی کے خیال کے سوا کوئی اور تصوّر کیونکر سما سکتا ہے :یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری زندگی کی رُوح فرسا تلخیوں کی علمبردار ہے۔ ممکن ہے یہ دورِ ابتلا زیادہ عرصہ تک نہ رہے اور چند سال کے بعد اس رنگ کی شاعری کا مقصد حل ہوجائے اور وہ بیکار سی چیز ہو کر رہ جائے مگر نئی شاعری جس میں زندگی کے صحیح تجزیے کثرت سے موجود ہیں ہمیشہ غیر فانی رہے گی +

مخمور جالندھری

لمحۂ فکریہ

مسلسل یورشِ آلام سے راحت نہیں ملتی
سکوں سے فکر اور تدبیر کی مہلت نہیں ملتی
تفکّر کی وہ کثرت وہ پریشانی کا عالم ہے
وفورِ اضطرابِ غم سے ہر شے مائلِ رَم ہے
مگر کچھ واقعے ایسے بھی ہیں دنیائے فانی میں
بہا دیتے ہیں جو مجھکو تصوّر کی روانی میں

ثمردار ایک شاخِ سبز سے جب پھل ٹپکتا ہے
ہوا کی تیز رَو میں جب کوئی ذرّہ بھٹکتا ہے

لبوں میں دب کے جب بیمار کا دم ٹوٹ جاتا ہے
جب اک ہچکی میں قیدِ زندگی سے چھوٹ جاتا ہے
اندھیری رات میں جب ڈر سے روحیں تلملاتی ہیں
جب اک ویران سے مرقد کی شمعیں جھلملاتی ہیں
جب اک دیوار پر ننھی سی چیونٹی گر کے چڑھتی ہے
کنارے کی طرف جب پیچ کھا کر موج بڑھتی ہے
کڑکتی دھوپ میں جب چُن کے تنکے چیل لاتی ہے
گھنی شاخوں میں جب اک پیڑ پر مسکن بناتی ہے
جب اک بھرا ہوا چیتا چکاروں پر لپکتا ہے
جب اک سہما ہوا خرگوش بل میں جا دبکتا ہے
بگولا اُٹھ کے ہو جاتا ہے جب اوجھل نگاہوں سے
جب اڑ جاتی ہے تتلی بن کے بو خوش رنگ پھولوں سے
سرِ کہسار منڈلاتے ہیں جب بادل بگولا سے
دھواں سا دُور جب اٹھتا ہے اک سادھو کی کٹیا سے
جہنم آفریں جب دھوپ ساون کی نکلتی ہے

جوانی لے کے اک انگڑائی جب کروٹ بدلتی ہے
نظر چُبھتی ہوئی سی دل میں جب مسکن بناتی ہے
کثیر انبوہ سے جب اک دوشیزہ منہ چھپاتی ہے
ستارا تھک کے جب شمعِ سحر سا ٹمٹماتا ہے
فلک پر ایک دھاری سی بنا کر ٹوٹ جاتا ہے
جہاں میں دیوِ خونخواری کے جب تیور بگڑتے ہیں
نزاع و جنگ سے جب امن کے خرمن اُجڑتے ہیں
تو پھر غوطے لگاتا ہوں میں سیلابِ تفکّر میں
میں اکثر ڈوبتا ہوں بحرِ نایابِ تفکّر میں

ایک غریب طبقہ سے گذرتے ہوئے

افلاس ہے حاکم یہاں اور غم سپہ سالار ہے
اس سلطنت میں عیش سامانی ذلیل و خوار ہے
خاموشیوں کی گود میں ہیں شورشیں سوئی ہوئی
تابانیاں ہیں ظلمتوں کے غار میں کھوئی ہوئی
چاروں طرف ہے خامشی اور زندگی نابود ہے
غمگینیاں پیدا ہیں امکانِ خوشی مفقود ہے

عزلت نشیں ہے زندگی اک جھونپڑی میں گھاس کی
پھیلی ہوئی ہیں دو و بائیں بھوک کی اور پیاس کی
فاقہ کشی بے چارگی مہلک سوا ہیں موت سے
آزار و ناداری یہاں جنگ آزما ہیں موت سے
اخلاق کی تخریب کے درپے یہاں اوہام ہیں
جہل اور ناشائستگی کی لعنتیں بھی عام ہیں
غمگین چہروں پر ہے زلفِ مفلسی بکھری ہوئی
آلودۂ آلام ہیں کچھ صورتیں نکھری ہوئی
کافر جوانی پیرہن کی قید سے آزاد ہے
حسنِ تکلف دوست کتنا اس جگہ برباد ہے
خاموش ہیں چولھے اور آتش پیٹ کی دہکی ہوئی
لیکن فضا ہے موجِ بوئے بادہ سے مہکی ہوئی
نادار بچے ہیں مرا یوں راستہ روکے ہوئے

رہگیر کو جیسے لٹیرے دشت میں گھیرے ہوئے
میرے لباسِ فاخرہ کو دیکھکر مرعوب ہیں
پھیلے ہوئے ہیں ہاتھ کچھ پیسے انہیں مطلوب ہیں
یوں دیکھتے ہیں مجھ کو جیسے میں خدائے دہر ہوں
اور میں کہ دل ہی دل میں شاکیِ ہوائے دہر ہوں
انسان ہیں تو کس لئے دنیا میں یہ مجبور ہیں
کیوں ان کے دل ہر وقت درد و کرب سے معمور ہیں؟
ان کے لئے روزی نہیں ان کے لئے دھندے نہیں
اے خالقِ کون و مکاں کیا یہ ترے بندے نہیں؟

نرالا کاروبار

بے نواؤں سے ہیں یوں لبریز سڑکیں رہگذار
کھیت پر دَل ٹڈیوں کے جیسے منڈلائے ہوئے
گڑگڑا کر مانگتے ہیں بھیک ہر رہگیر سے
عاجزی سے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے

کوئی ہے نامِ خدا پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
کوئی ناکام ہے اک جھولی سی لٹکائے ہوئے
"کان سے بہری ہوں مَیں، منہ میں زباں رکھتی نہیں"
یہ عبارت کوئی کاغذ پر ہے لکھوائے ہوئے

سوز کی نَے میں ہے کوئی رہگذر پر نالہ بار
جسم پر کچھ زخم مصنوعی سے بنوائے ہوئے
رینگتا ہے خاک پر کوئی مکوڑوں کی طرح
بھیک کی خاطر کوئی چلتا ہے لنگڑائے ہوئے
گھر سے نکلا ہے کوئی لے کر فلاکت کا جلوس
خود کو دو پہیّوں کے اک چھکڑے پہ لدوائے ہوئے
یہ نظر آئیں گے ہر کوچے میں ہر بازار میں
جھڑکیاں کھاتے ہوئے پیرایۂ ادبار میں
سَو طرح کے ڈھنگ ان کو مانگنے کے یاد ہیں
یہ بہانے "ہم ہیں بابا مبتلا آزار میں
"خانماں برباد ہیں تقدیر ہے پھوٹی ہوئی
"گھر ہمارے بہہ گئے سیلابِ آفت بار میں
"قحط کی یورش سے دست و پا ہیں مرجھائے ہوئے
"اب سکت باقی نہیں جنبش کی جسمِ زار میں"
یہ بہانے اور یہ دھوکے فسانے ہیں تمام

صاف ہوتی ہے بناوٹ کی جھلک گفتار میں

خانقاہیں، گھاٹ، مندر، مسجدیں، تکئے، مزار
چل رہا ہے بھیک کا ان سب گھروں میں کاروبار
یہ ادارے ہیں جو بیواؤں یتیموں کے لئے
ہے تن آسانوں کا ان کی بھیک پر دارومدار

ہوں جہاں یہ لعنتیں، بے شرمیاں اور خواریاں
کیوں نہ پھیلیں گی وہاں ادبار کی بے چینیاں

مجبوری

جگمگ، جگمگ ساری دکانیں جھلمل جھلمل ساماں
چنچل نٹ کھٹ گاہک خنداں خنداں، رقصاں رقصاں
ایک دکاں کے گوشے میں یوں زلفیں ہیں آوارہ
جیسے سپیرا اک چورستے پر کھولے ہو پٹارہ
باتیں کرنے میں نیلی رگ پیشانی کی پھڑکے
جوبن یوں اُبھرے اور ڈوبے قلبِ دوعالم دھڑکے
ہنسنے میں گالوں کے کنوئیں ہوتے جاتے ہیں گھرے
تیور کے انداز سپاہی دیتے ہوں جیسے پہرے
بیگانوں کی تند نگاہی بھولے پن سے روکے
گردن کو نیہوڑا کر اُن کو اُس جرأت پر ٹوکے
کھینچے آنچل جوبن پر ساری کی کور مروڑے

جیسے کبوتر بلّی کے ڈر سے پر اپنے سکوڑے
ہونٹ سمندر نشّے کے آنکھیں مستی کے ڈیرے
بالوں میں پُرنُور دھند لکے رخساروں میں سویرے
خطِّ جبیں کی پہلی رَو میں ننّھے تِل کی چھاؤں
جیسے اک ندّی کے کنارے چھوٹا سا اک گاؤں
نرم تبسّم کی موجوں میں زُلف اور عنبر مہکے
خال و خد سے شعلے لپکیں جیسے انگیٹھی دہکے
یہ "اندھیر۔۔۔گرانی" گاہک حیرت سے مُنہ کھولے
سوداگر کی بات نہ پلٹے آس کی ناؤ ڈولے
من بھاتی چیزوں کو دیکھے، تھامے، سوچے چھوڑے
چمڑے کے بٹوے کو ہاتھوں سے رہ رہ کے مروڑے
مَیں رستے پر سنگِ مجسّم کیسے پاؤں بڑھاؤں
بڑھ کے دکاں کے اندر پہنچوں حسن کے کام آجاؤں
تاجر کی ہٹ توڑ کے رکھ دوں لیکن دنیا داری!!
ان دیکھی، ان جانی صورت ہوں خاموش پجاری!!

شادی

سرنگوں ہے سرخ ساری میں دُلھن لپٹی ہوئی
رسم کی زنجیر بے آواز میں جکڑی ہوئی
پاس ہی بیٹھا ہے اک بوڑھا سا دولھا شادماں
پوپلا مُنہ اور چہرہ جھرّیوں کا کارواں
ہو رہا ہے نقرئی تھیلی سے دوشیزہ کا بیاہ
کر رہے ہیں مِل کے سب کمسن جوانی کو تباہ
آئے ہیں پھیروں پہ یوں بھائی دلھن کو تھامنے
لائیں جیسے بھیڑ کو ننگی چھری کے سامنے
گھر لئے جاتا ہے بوڑھا دھوم سے اک زندہ لاش

ایک تارہ ٹکڑے ٹکڑے ایک گوہر پاش پاش
گھر لئے جاتا ہے کونپل کو مسلنے کے لئے
کہنگی سے نوجواں عصمت کچلنے کے لئے
گھر لئے جاتا ہے یہ شعلہ بجھانے کے لئے
تین پہلی لڑکیوں کی ماں بنانے کے لئے
لے چلا ہے حُسن کو مذموم کرنے کے لئے
ازدواجی لطف سے محروم کرنے کے لئے
گھر لئے جاتا ہے یہ غنچہ مٹانے کے لئے
کمسنی ہی میں اسے بیوہ بنانے کے لئے
ہنس رہی ہے سنگدل ماں خوش ہے دنیادار باپ
ختم کرنے کو ہے پنڈت آخری منتر کا جاپ
خود غرض، مکّار اور بزدل براتی شاد کام
ہو رہا ہے ایک دوشیزہ کے خوں کا اہتمام

بیوی کا خط

پچھلے ہفتے سے ہے مجھ کو اُن کے خط کا انتظار
لا رہا ہے ڈاکیہ اُن کا پیامِ زرنگار
کانپتی ہیں یوں لفافہ کھولتے وقت انگلیاں
لہلہائیں جس طرح ٹھنڈی ہوا میں ٹہنیاں
دل کی دھڑکن میں ہے لحنِ مطربہ کا زیر و بم
اُن کا اندازِ نگارش دل نشیں جادو رقم

فکر مت کرنا کہ میں آرام سے ہوں پران ناتھ!!
آپ کا ننھا "مدن" رہتا ہے ہر دم میرے ساتھ

اس کو باہر گھومنے جانے نہیں دیتی ہوں میں
آم، پاپڑ، چاٹ بھی کھانے نہیں دیتی ہوں میں
ہو گیا تھا آپ کی اوشا کو میعادی بخار
ایک لائق ڈاکٹر آتا تھا دن میں چار بار
اپنی صحت کا بھی ایشور کے لئے رکھنا خیال
تازہ "تازہ دودھ میں بالائی لینا روز ڈال
ڈال دینا گرم کپڑے دھوپ میں اک کھاٹ پر
ورنہ ساون میں ہے ان کو کیڑا لگ جانے کا ڈر
چادریں دھوبن نہیں لائی تھی پچھلی مرتبہ
یاد رکھنا بھول مت جانا انہیں لینا منگا
ہاں اگر "فیروز" درزی آئے پیسوں کے لئے
اس سے کہنا "اتنے بھدّے سوٹ کیوں تو نے سئے؟"
آپ نے لکھا ہے "شاید جاؤں میں لاہور بھی"
جاؤ تو لانا کوئی اچھی سی شیشی عطر کی
میری ساری کے لئے جو لائے تھے بازار سے

بھیج دینا اک کنارہ لے کے ویسا ہی مجھے
اک سہیلی ہے مری غمخوار میری دردمند
آگئی ہے اس کنارے کی اُسے رنگت پسند
ہاں جو "شبو" آئے برتن صاف کرنے کے لئے
دھیان رکھنا، چور ہے برتن کوئی کھسکا نہ لے
آپ کو میری قسم دینا ذرا جلدی جواب
ورنہ دل میرا رہے گا وقفِ کرب و اضطراب"

لگ گئی ہے خط کو پڑھتے ہی مرے تن من میں آگ
پیار کی باتیں نہ اس میں پیار کے رنگین راگ

گناہِ بے لذّت

مَیں شرافت کا گلا گھونٹ کر آج آیا ہوں
بے حیائی دلِ بے باک میں بھر لایا ہوں
مَیں نے مشکل سے دبائی ہے ہر آوازِ ضمیر
سازِ بشکستہ مرے ہاتھ سے ہے سازِ ضمیر
آج آیا ہوں خدا سے مَیں بغاوت کر کے
ننگ و ناموس کا سامانِ ہلاکت کر کے
دھجّیاں دامنِ غیرت کی اُڑا آیا ہوں
اسی اُمّید کے برتے پہ چلا آیا ہوں

میرے بھڑکے ہوئے جذبات کی بجھ جائیگی پیاس
کچھ دنوں کے لئے جُڑ جائے گی ٹوٹی ہوئی آس
سائے میں گیسوئے مشکیں کے چھپالے مجھ کو
بے گناہی کی ندامت سے بچالے مجھ کو

اِن رنگے ہونٹوں پہ امواجِ تبسّم کی لکیر
سُرخیٔ خونِ حیا ہے کہ ترا خونِ ضمیر
یہ ترے نغمے، ترے قہقہے، پھیکے پھیکے
یہ ترے خال یہ خط زرد سے دھندلے دھندلے
دے رہے ہیں تری عفّت کی تباہی کا ثبوت
ہے ترا رنگ ترے دل کی سیاہی کا ثبوت
تیرا چوسا ہوا یہ جسم، یہ زندہ اک لاش
تیرے اعضائے حسیں تیرے لئے وجہِ معاش

سوچ تو تیرے لئے زندہ رہیں گے کب تک؟
تیری اوباشں خصالی کو سہیں گے کب تک؟
میری تنقید پہ ابرو کی کمانوں کو نہ کھینچ
غیظ میں کھو کھلے جوبن کی اُٹھانوں کو نہ کھینچ
اپنے پچکے ہوئے سینے سے لگا لے مجھ کو
اے گنہگار، گنہگار بنا لے مجھ کو

تیرے چہرے پہ خوشی ہے نہ تری آنکھ میں نور
زندگی میں تری کیف اور نہ ترے دل میں سرور
نہ ہیں معصوم ترے لب نہ جبیں ہے بیدار
بال ہموار ہیں تیرے نہ اچھوتے رخسار
تیری خواہش ہے تجھے پھر نہ نظر آؤں میں
جیب الٹ کر تری محفل سے چلا جاؤں میں

میں بھی نادم ہوں مرا سینہ پھنکا جاتا ہے
اس گنہ زار میں دم میرا گھُٹا جاتا ہے
کچھ خبر بھی ہے تجھے کیا غلطی کی میں نے
چند لمحوں کو تری لاش خریدی میں نے
اچھا رخصت کوئی اور اب مرے بعد آئے گا
تیری کچلی ہوئی لاش اور کچل جائے گا

میری محرومیاں

میں ہوں زحمت کشِ افلاس یعنی بے بضاعت ہوں
ہلاکِ تیغِ محکومی ہوں مجروحِ فلاکت ہوں
وطن کا نام کیا لوں شرم سے گردن نہیں اُٹھتی
غلام آباد کا باشندۂ برگشتہ قسمت ہوں
مری بے کیف ہستی سے ہے نفرت سارے عالم کو
زمیں کی پیٹھ پر بے کار اک بارِ نجاست ہوں
زباں پر قفلِ قانونؔ اور قیدیں دست و بازو پر
شجاعت ہو بھی تو کس کام کی میں پست ہمت ہوں

مری روزی پہ ڈاکے، جبر کے قبضے زمینوں پر
خرابِ یاس و حرماں ہوں شکارِ صد مصیبت ہوں
سزائے ابتہاج و مسرّت خوشی قسمت نہیں میری
مسلسل اشکِ خونیں سے ہے لبریز آستیں میری

تعارف جاہ و حشمت سے نہ عظمت سے شناسائی
نہ بخت و اثر گوں میں نشۂ جمشیدی و دارائی
نہ میرے ذہن نے دُنیا نئی ایجاد فرمائی
نہ دنیا میری فکرِ عالم ایجادی سے گھبرائی
نہ میرے ہاتھ میں ملکی سیاست کی عناں آئی
نہ میں نے کی سیاست گاہ میں قانون آرائی
مسلسل یورشِ رنجِ غلامی سے مرے دل میں
جہاں گیری کے عزمِ منجمد نے لی نہ انگڑائی
نہ میرے کارخانوں کے قد آور دُود دانوں سے
دُھوئیں کی لہر اُٹھ کر وسعتِ افلاک پر چھائی

رگِ عالم میں میرے مجتہد ذوقِ تعذّب نے
تموّج اور جدّت کی نہ رنگیں لہر دوڑائی
مری توپوں کی بندوقوں کی، طیّاروں کی ہیبت سے
زمیں کانپی نہ روحِ آسمانِ پیر تھرّائی
نہ کی پرواز میرے جاں فروشوں نے فضاؤں پر
سمندر پر نہ کی میرے جہازوں نے صف آرائی
مرے جبروت اور طاقت سے کوئی قوم گھبرا کر
مرے در پر نہ خفیہ عہد ناموں کے لئے آئی
دیارِ غیر میں میری گرفتاریِ مبہم پر
کبھی میری حکومت غیظ میں آکر نہ غرّائی

میرے معجزے

تجھے یوں عشق کا اعجاز دکھایا میں نے

کر دیا آگ سے لبریز تری سانسوں کو
بھر دیا برق کی لہروں سے ترے ہونٹوں کو
جسم میں تیرے حسیں لوچ سموئے میں نے
فتنے اعضائے جواں میں ترے بوئے میں نے
چال میں تیری کیا رقص بھنور کا پیدا
نرم سا ڈال دیا تیری کمر میں جھولا

تیرے گالوں کے گڑھے پاٹ دئے شعلوں سے
ساغر آنکھوں کے بھی چھلکائے حسیں غمزوں سے
تیری سانسوں کو دیا تیز سے دھاروں کا بہاؤ
قدِ رعنا کو عطا کر دیا شمشیر کا تناؤ
گفتگو میں تری رس گھول دیا پھولوں کا
تیرے نغموں کو دیا ساز رواں جھرنوں کا
پہلے تھا شانۂ بلّور ترا ایک چٹان
اب ہے دو تازہ بگولوں کی جواں عمر اٹھان
رکھ دئیے تیری نگاہوں میں اشارے میں نے
قافلے پلکوں پہ مستی کے اُتارے میں نے
بند دل میں رُکے طوفان کے سب توڑ دیے
سینے میں قید اُمنگوں کے ہرن چھوڑ دیے
گیت رگ رگ میں تری چھیڑ دئیے ساون کے
بھرے خوشبو سے کٹورے یہ ترے جوبن کے
کھینچ کر تیرے لبوں تک ترا دل لے آیا

تیرے ٹھٹھرے ہوئے جذبات کو بھی گرمایا
تیری آغوش کی فردوس کا در کھول دیا
نرم باہوں کو تری حلقۂ زنجیر کیا
تیرے سینے کو سمٹنے کے دئیے رنگ ایسے
خوف سے بل میں ہوں دبکے ہوئے آہو جیسے
تجھے انگڑائی سے اظہارِ تمنّا بخشا
نیچی نظروں کو تری راز کا اخفا بخشا
تیرے اعضا کو پھڑکنا بھی سکھایا میں نے
تیری نبضوں کو دھڑکنا بھی سکھایا میں نے

اپنے قابل تجھے اس طرح بنایا میں نے

اُتار چڑھاؤ

سینے میں چشمہ ہے پگھلے ہوئے پارے کا رواں
اک دہکتے ہوئے کمرے میں ہیں ہم دونوں بند
سانس ہے ایک بھبکتے ہوئے انجن کا دھواں
آنکھ کے ڈوروں سے شعلوں کی قطاریں ہیں بلند

دل کی دھڑکن ہے کہ بپھری ہوئی لہروں کا خروش
در و دیوار سے پیدا ہے لپکتی ہوئی آنچ
ہونٹ تپتی سی سلاخوں کی طرح سوز فروش

سبھی نبضوں میں سبک گام ہے پگھلی ہوئی کانچ

گال بھٹّے میں ہیں پکتی ہوئی اینٹوں کی طرح
خون رگ رگ میں خراماں ہے اک آندھی بن کر
ہے پسینہ بھی جلے تیل کی چھینٹوں کی طرح
حلق سے تھوک اترتا ہے کٹاری بن کر

جسم ہیں آگ کی لپٹوں میں لہکتے شہتیر
بوسے ہیں پگھلی ہوئی لاکھ کی مہروں کے نشاں
تند شعلے سے ہے رقصاں سا شرر دامنگیر
جس طرح مہر کی آغوش میں ذرّے کا جہاں

یوں اُٹھا جوشش میں طوفاں کہ رگیں کانپ گئیں
دل کے پردے کو بڑے زور کے جھٹکے سے لگے
برف سے سیل کی امواج ہمیں ڈھانپ گئیں

سبھی نبضوں کے شررزار میں اولے سے پڑے

در و دیوار ہیں بے تاب و تواں فوجِ غنیم
دل کی دھڑکن ہے کہ ٹھہری ہوئی لہروں کا سکوں
سانس ہے صبح کی آہستہ قدم موجِ نسیم
دل کے بھڑکے ہوئے جذبات ہیں خاموش جنوں

خون رگ رگ میں ہے برسات کے بادل کی طرح
سینہ ہے جاڑے میں برسے ہوئے مینہ کا تالاب
ہونٹ شبنم سے ہیں بھیگی ہوئی کونپل کی طرح
اور پسینہ ہے سرِ کوہ سے گرتا برفاب

تند شعلہ ہے اب اس طرح شرارے سے الگ
چاند جس طرح ہر اک ننھے سے تارے سے الگ

بملا کا جہیز

چار سُو بکھرا ہوا ہے گھر کے کمروں میں جہیز
بام و در جنّت بداماں گوشہ گوشہ زر فروش
منتظر مشتاق، نظروں کے درخشاں سے گروہ
دیکھتے پھرتے ہیں سیم و زر کا مہلک احتشام

ایک کونے میں پڑی ہے میز پر "سنگر مشین"
جو فقط بچوں کے کپڑوں کے لئے کام آئے گی
سامنے ہے اک گراں قیمت "فلپ کا ریڈیو"
جس پہ ہوں گی نشر کذب آمیز خبریں جنگ کی
ساریاں ہیں جن پہ ہے کاڑھا ہوا طلّے کا کام
جو فقط میلوں میں تہواروں میں پہنی جائیں گی

زیوروں سے جھلملاتی ڈبیاں لبریز ہیں
جن میں ایسے بھی ہیں زیور جو نہ پہنے جائیں گے
اک بڑے آئینے کی ہے میز جس کے سامنے
زندگی کا اک بڑا حصّہ گذارا جائے گا
سرخیوں کی شیشیاں ہیں پوڈروں کے بکس ہیں
جن سے ڈھانپے جائیں گے بے رنگ چہرے کے عیوب
ایک تھالی سیمگوں ٹکڑوں سے بھی لبریز ہے
جن سے پُر کی جائے گی فیشن کے سوداگر کی جیب

کر رہے ہیں سب براتی یوں خیال آرائیاں
"واقعی اپنا "نرنجن داس" نکلا خوش نصیب"

عاجزی سے ہاتھ ہے باندھے ہوئے "بملا" کا باپ
جس کے لب پر ہے زبردستی کی پھیکی سی ہنسی
کوئی کیا جانے کہ وہ کیوں کھل کے ہنس سکتا نہیں

پک نِک

گا رہی ہے سانولی کافن گراموفون پر
مَل رہا ہے جسم ندّی میں منوہر جھوم کر
مچھلیوں کی تاک میں ڈالے ہوئے بنسی کی ڈور
دُھن رہا ہے زور سے سر فیض احمد شاہ زور
بھر رہا ہے تیل کے چولھے میں پھونک "احمد حسن"
کر رہا ہے صاف "اندر ناتھ" مرغے کا بدن
نیم کے سائے میں پکّے آم ہیں رکھے ہوئے
پیڑ پر کوّے جھپٹنے کو ہیں پر تولے ہوئے

گاؤں کا مریل سا کتّا آگیا ہے سونگھتا
تازہ مکھن کی لپیٹ اور خونِ تازہ مرغ کا
کر رہا ہے رقص شوکت بھر کے رقاصہ کا رُوپ
جس کو گھیرے ہیں لئے ہیں "نیم" "عظمت" اور "بھوپ"
قہقہوں میں گھُل رہی ہے بادلوں کی گھن گرج
ہنستے ہنستے ہو گئی ہیں کچھ کلاہیں سر پہ کج
دے رہا ہے "گوربچن سنگھ" اس طرح ڈھولک پہ تھاپ
جیسے گونجے تھان سے چھوٹے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپ
تاش بکھرے سے ادھوری بازیوں کے ہیں نشاں
آج ان بے کار سے کھیلوں کی فرصت ہے کہاں
دفعتہً خوش رُو منوہر زور سے چلّا اُٹھا
"تکیہ صابن کی بتاؤ کون اٹھا کر لے گیا"؟
ایک کوّے پر نگاہیں شب چرن کی جا پڑیں
سب کے ہونٹوں پر ہنسی کی بجلیاں لہرا گئیں
شرم کے مارے منوہر یک بیک چپ ہو گیا

اتنے میں دور ایک کونے سے دوبارہ شور اُٹھا
اس دفعہ شور آفریں خوش رنگ "اندر ناتھ" تھا
"اے تجمل، لے بچن، دوڑو کہ مرغا پک گیا!!"
اتنا سننا تھا کہ بزمِ رقص برہم ہو گئی
ٹوٹ کر یہ فوجِ بے ترتیب کھانے پر گری
کوئی تھوڑا اور کوئی حد سے زیادہ کھا گیا
کوئی خالی ہاتھ ہی اُن سب کا مُنہ تکتا رہا
کشمکش سی تھی مگر شکوہ سرا کوئی نہ تھا
مسکراہٹ تھی لبوں پر اور گلہ کوئی نہ تھا

جن میں ہوں اس رنگ کے نغمے محبت اور اُدھم
ایسے لمحے آدمی کی زندگانی میں ہیں کم

انوکھا بیوپاری

بچی ہوئی بھی ذرا حلق میں انڈیل تو لوں
چلوں گا ساتھ ترے دیکھنے تری فردوس

مگر یہ تیری گھنی اور بٹی ہوئی مونچھیں
کھچے کھچے سے خدوخال سرخ سرخ آنکھیں
بہی ہوئی تری ٹھوڑی پہ پان کی لالی
تری پھٹی ہوئی لنگی کا سرنگوں طرّہ
یہ تیرے ٹخنوں سے اونچی گلی سڑی شلوار

دبی ہوئی ترے ہونٹوں میں "لمپ" کی سگریٹ
اور اس سے اُٹھتے دھوئیں کے بڑے بڑے حلقے
ڈرا رہے ہیں مجھے روکتے بھی ہیں لیکن

چلوں گا ساتھ ترے دیکھنے تری فردوس
بچی ہوئی بھی ذرا حلق میں انڈیل تو لوں

اُلجھ گئی ہے مری سانس میرے سینے میں
یہ سیڑھیاں ہیں کہ گیسوئے دوست کے بل ہیں
سجا ہوا سا یہ کمرہ ہے خواب گاہِ جمیل
شکن سے پاک ہے رنگیں پلنگ کی چادر
پڑے ہیں کونے میں کیوں نہلؔ صابن اور حمام!
میں سوچتا ہوں بیک وقت ایک ہی کمرہ

نشاط گاہ بھی ہے اور غسل خانہ بھی
مہک رہا ہے ہر اک گوشہ عنبریں ہے فضا
اُلجھ گئی ہے مری سانس میرے سینے میں
یہ سیڑھیاں تھیں کہ گیسوئے دوست کے بل تھے

یہ کیا کہا اک اٹھنّی تجھے ابھی دے دوں
مطالبہ یہ ترا دل کو ناگوار نہیں
گراں نہیں تری جنّت میں داخلے کا صلہ

میں ہو چلا تھا ترے انتظار سے بیزار
چلا گیا تھا کہاں چھوڑ کر مجھے تنہا؟
ترے جلو میں یہ سب کون ہیں بتا تو سہی؟
مجھے کنکھیوں سے اس طرح مسکرا کے نہ دیکھ

مری نگاہ میں جچتا نہیں ہے تیرا مال
یہ مانتا ہوں کہ عمر اُس کی بیس سال کی ہے
مگر پسند نہیں مجھ کو خد و خال اس کے
یہ دوسری — نہیں یہ بھی مجھے پسند نہیں
کمر ہے اس کی خُمِ مَے سے بھی عریض وطویل
یہ تیسری — نہیں اس سے وہ دو ہی اچھی تھیں
کھٹک رہی ہے نگاہوں میں ناک چپٹی سی
سُن اے بہشتِ سیہ کار کے خدائے ذلیل!!
مری طرف نہ یوں تیور چڑھا چڑھا کر دیکھ
مرے گناہ کے قابل نہیں تری حوریں
بتا کے دام بہت کم، نہ دے مجھے لالچ
میں تیرے اس کرمِ بے کراں سے باز آیا

رکشا والا

رکشا والا دوڑتا جاتا ہے جلتی دھوپ میں
شہر کی مشکیں سڑک کے سینۂ پُرسوز پر
پاؤں ننگے، سر بھی ننگا، نیم عریاں ہے بدن
جس طرح بے برگ و بار اِک پیڑ بر بادِ خزاں

آگ برساتا ہے سر پہ دوپہر کا آفتاب

پاؤں میں پگھلا ہوا سیسہ ہے جلتا کولتار
اک مہاجن اپنی بھاری توند پھیلائے ہوئے
رکشا میں بیٹھا ہے یوں آرام سے چھاتا لگائے
ٹاٹ سے ڈھانپی ہوئی جیسے مرے بھینسے کی لاش
جا رہی ہو لد کے چھکڑے پر کسی بازار سے

رکشا والا بھاگتا ہے ہانپتا سر مارتا
ہاتھ کی گھنٹی سے لوگوں کو ہٹاتا راہ سے
بھیڑ آتی ہے نظر تو روک لیتا ہے قدم
رکشا والے کو مگر کچھ سوچنے کا حق نہیں
کانپ اُٹھتا ہے مہاجن کو گرجتا دیکھ کر
سانس کیوں لیتا ہے چل بے او گدھے!! جلدی سے چل"

رکشا والا دوڑتا جاتا ہے جلتی دھوپ میں
شہر کی مشکیں سڑک کے سینۂ پُرسوز پر
اپنے پیچھے چھوڑتا جاتا ہے لوگوں کا ہجوم
مانگنے والوں کا مجمع، چھپنے والوں کا گروہ
گاہکوں کا دبدبہ زرّیں دکانوں کا شکوہ
بھاگتا ہے برق رفتاری سے اس اُمّید پر
ہو کے خوش دے گا مہاجن چند پیسے فالتو

رکشا والا رُک گیا ہے منزلِ مقصود پر
دے رہا ہے یوں اترنے میں مہاجن کو مدد
جس طرح مزدور شیشوں سے بھرا اک ٹوکرا
فرش پر رکھتے ہوئے لے سانس اطمینان کا
مسکراتا ہے مہاجن ایک اکنّی پھینک کر

رکشا والے کو مگر کچھ سوچنے کا حق نہیں
چونک اُٹھتا ہے کسی کی رعب دار آواز پر
"چل دریبے کی اکنّی ہی تجھے دے دونگا میں"

رکشا والا دوڑتا جاتا ہے جلتی دھوپ میں
شہر کی مشکیں سڑک کے سینۂ پُرسوز پر

چور دروازہ

کوئی آہٹ، کوئی دستک، کوئی جنبش نہ ہوئی
در و دیوار میں ہلکی سی بھی لرزش نہ ہوئی
لیکن افکار کے سیلاب، خیالوں کے پرے
تابشِ حُسن سے معمور ستاروں سے بھرے
جگمگاتی ہوئی لہروں میں بڑھے آتے ہیں
جانے کس راہ سے محفل میں چلے آتے ہیں
مرے احباب جواں، مسخرے افسانہ نگار
تتلیوں کا جو کیا کرتے ہیں ہر روز شکار

خود کو کہتے ہیں بڑے فخر سے جو برق انداز
ہے جنہیں اپنی ہمہ گیر فراست پر ناز
ان کے بہکے ہوئے قدموں کی صدا سُن نہ سکے
سازِ رفتار کی جھنکار پہ سر دھن نہ سکے
مری آغوش میں ان کو وہ نظر آ نہ سکے
غور سے دیکھا کئے اُن کو مگر پا نہ سکے
خوب جی بھر کے ہنسے، راز کی کچھ باتیں کیں
لبِ سوزاں سے حسیں لب نے ملاقاتیں کیں
نغمے بھڑکی ہوئی سانسوں کے سنائے میں نے
گیسو مہکے ہوئے آنکھوں سے لگائے میں نے
انھیں گھر تک میں گیا چھوڑنے ان کے ہمراہ
ہوئے احباب نہ اس راز سے لیکن آگاہ
آتے جاتے نہ کسی آنکھ نے دیکھا مجھ کو
سب نے محفل ہی میں بیٹھے ہوئے پایا مجھ کو

تالاب

گھنے پیڑوں کے سایوں کی قطاروں میں چمکتا ہے
پُرانے، بدنما تالاب کا سڑتا ہوا پانی
ہزاروں سال سے جکڑی ہوئی تخیّل کی صورت
تعفّن جس میں بھر جاتا ہے صدیوں کی غلامی سے

کناروں پر سے کچھ اُکھڑی ہوئی اینٹوں کی درزوں میں
پُھدکتے پھرتے ہیں کیچڑ میں لت پت زرد رُو مینڈک
جوؤں کا رقص جیسے چیتھڑوں میں اک بھکاری کے
پھٹے بدبو بھرے کپڑوں کو جو رازق سمجھتا ہے
چمکتا ہے سڑے تالاب کا سڑتا ہوا پانی
جمی ہیں جابجا بدرنگ کائی کی تہیں جس پر
ہزاروں گندے کیڑے پا رہے ہیں پرورش جس میں

میں اکثر سوچتا ہوں اور پہروں سوچتا ہوں میں
مرا مجبور و مفلس ذہن بھی تالاب ہے جس میں
خیالوں کی نجاست سے بھرے اجرام پلتے ہیں

ابھی کل ہی کا قصّہ ہے کہ اک نادار دوشیزہ
سڑے تالاب کی سخت اور گندی کھال کی مچھلی
پھٹے کپڑوں میں لپٹی، میل سے چکٹی، نزاکت سے
لگی ہنس ہنس کے میرے پاس آکر ہاتھ پھیلانے
ادھر وہ رحم کی طالب، ادھر میں سوچ میں گم تھا
بُری کیا ہے — اگر اک رات اس کے ساتھ کٹ جائے

گھنے پیڑوں کے سایوں کی قطاروں میں چمکتا ہے
پرانے، بدنما تالاب کا سڑتا ہوا پانی
ہزاروں سال سے جکڑی ہوئی تخئیل کی صورت
تعفّن جس میں بھر جاتا ہے صدیوں کی غلامی سے

ٹھکانے

تیرا حُلیہ ترے کردار کا آئینہ ہے
تیرا تانگہ ہے ترے حالِ پریشاں کی دلیل
یہ پھٹے گدّے، یہ ہچکولے، یہ مریل گھوڑا
چغلی کھاتے ہیں تری بے سروسامانی کی
تیری باتوں سے مجھے نشے کی بُو آتی ہے
اُٹھ رہی ہیں تری باتوں سے مہکتی لپٹیں
کتنا بازاری زباں پر تجھے حاصل ہے عبور

دھڑکنیں تیز ہوئی جاتی ہیں میرے دل کی
لطف اندوز فسانے ہیں زباں پر تیری
جی میں آتا ہے کہ بند اپنی میں آنکھیں کر لوں
اور جا پہنچوں سحر زار شبستانوں میں

تجربے تیرے تری بخشش بہا دولت ہیں
حسن کے جادۂ زریں کے پرانے رہبر!!
کتنے چمکیلے، رنگیلے ہیں یہ تیرے الفاظ
"بابو جی ہاتھ جو چھو جائیں تو میلی ہو جائیں
ایسی خوش رنگ، پُر انوار، بلوریں کرنیں
میرے تانگے کی بنا کرتی ہیں زینت اکثر
اور اُترتے ہوئے آہستہ سے کہہ جاتی ہیں
"دلّی دروازے کی تاریک گلی کے اندر
گھنگروؤں والے میاں شاہ کے تکئے کے قریب
نیم کی دائیں طرف زرد مکاں ہے میرا

ہنتے چڑھ جائے جو آسامی کوئی لے آنا"
دنیا، بابوجی!! خدا سے بھی نہیں ڈرتی ہے
ایسے کتنے ہی پتے اور بھی ہیں یاد مجھے"

کتنے چمکیلے، رنگیلے ہیں یہ تیرے الفاظ
دھڑکنیں تیز ہوئی جاتی ہیں میرے دل کی
آئی جاتی ہے تری منزلِ مقصود قریب
اور اے دوزخِ رنگیں کے پرانے رہبر!!
تیری یہ طنزِ دل آزار، یہ پھیکی تنقید
"دنیا، بابوجی خدا سے بھی نہیں ڈرتی ہے"
میرے بے خوف، جنوں کار عزائم کے لئے
ایک سخت آہنی زنجیر بنی جاتی ہے
آج یہ جادو مگر مجھ پہ نہیں چل سکتا

تضیعِ اوقات

آئے نہیں خوش پوش، خوش اطوار مرے دوست
تکتا ہوں میں بیٹھا ہوا رہ دیر سے اُن کی
وعدہ تھا کہ ہوں گے سبھی ہوٹل میں اکٹھے
بھرتا ہوں میں رنگین "لمونیڈ" کے دو گھونٹ
کثرت سے میں اس چیز کے پینے کا ہوں عادی
اکثر مجھے ہو جاتی ہے کھانسی کی شکایت
دلچسپی کے سامان نگاہوں سے ہیں اوجھل

جلتی ہوئی سڑکوں کی طرح آنکھیں ہیں ویران
آئے نہیں خوش پوش، خوش اطوار مرے دوست

ہوٹل کی چمکتی ہوئی دیوارِ حسیں کو
چھوتی ہوئی بہتی ہے عفونت بھری نالی
مکروہ غلاظت سے سیہ رنگ ہے پانی
یہ پانی کبھی صاف تھا انوارِ سحر سے
بن سکتا تھا پیاسے کے لئے رحمتِ باری
جمتی نہیں اب اس کے تکدر پہ نگاہیں
ہر قسم کی ہر رنگ کی ہے اس میں غلاظت
دُنیا میں ہے بکھری ہوئی کس درجہ نجاست
جم جاتے ہیں آئینے پہ بھی گرد کے ذرّے

پانی کو بڑے غور سے مَیں دیکھ رہا ہوں
طوفاں سے بھی ہے تیز تخیّل کا بہاؤ
دلچسپی کے سامان ہوئے جاتے ہیں پیدا
جاری ہے مرے سامنے صد رنگ تعفّن
اک چیتھڑا پانی میں ہے ڈوبا ہوا آدھا
جس پر ابھی تک خون کے دھبّے ہیں نمایاں
کس درجہ طرب خیز ہے اعجازِ تصوّر
کیا دیکھتا ہوں شہر کی دوشیزۂ چالاک
جس پر ابھی چھایا ہے نیا رنگِ جوانی
حیراں ہے جو تبدیلیٔ پُرکیف پر اپنی
کھڑکی میں سے لوگوں کی نگاہوں سے بچا کر
اک چیتھڑا شرماتی ہوئی پھینک رہی ہے
وہ چیتھڑا جس پر ہیں جواں خون کے دھبّے

پانی کو بڑے غور سے میں دیکھ رہا ہوں
دلچسپی کے سامان ہوئے جاتے ہیں پیدا

رنگیں ہے، پُراسرار ہے پانی کی غلاظت
پانی میں حسیں جسم کا ہے میل بھی شامل
مہکی ہوئی زلفوں کا مہکتا ہوا کچھ مَیل
کم کرتا ہے پانی کے بہاؤ کا تعفّن
اعجازِ تصوّر ہے کہ مَیں دیکھ رہا ہوں
گدرائے ہوئے، مہکے ہوئے جسم نہاتے
مَیں قلعے بنائے چلا جاتا ہوں ہوا میں
بھرتا چلا جاتا ہوں نجاست میں کئی رنگ
بہتر نہیں اس شغل سے خلوت کا کوئی شغل

تنہائی کی حماقت

راستے ہی میں تو پڑتا ہے مہندر کا مکاں
چند لمحوں کے لئے آج اُسے ملتا ہی چلوں
آجکل گھر سے نکلتے نہیں دیکھا اس کو
"اوہ تم ہو کہیں رستہ تو نہیں بھول گئے"
آنکھیں ملتا ہوا خوش خُلق مہندر بولا
"میں تو سمجھا تھا کہ جگدیش نے دستک دی ہے
آؤ بیٹھو میں تمہارے لئے شربت لاؤں"

بیٹھتے ہی مجھے اس بات کا احساس ہوا
اک تکلّف سے بھرے کمرے میں تنہا ہوں میں
کتنی شفّاف ہے آئینے کی سطح ہموار
نکھرا نکھرا نظر آتا ہے مجھے عکس اپنا
عکس کو ہنستے ہوئے دیکھ کے بول اٹھتا ہوں

"بیٹا!! ہنستے ہو ذرا شکل تو اپنی دیکھو"
موج میں کہہ تو گیا میں یہ طرب خیز الفاظ
دیکھ کر میز پہ ہنستی ہوئی تصویرِ جمیل
میری شرم اور ندامت کی کوئی حد نہ رہی

میز پر "جون کرافورڈ" کی رنگیں تصویر
ہے مرے دوست کے معیارِ نظر کی غمّاض
ارضِ مغرب کی جواں ساحرۂ خود سر عورت
مری ہمدم، مری ہمراز بنی جاتی ہے
سُن چکی ہے مرے لبریزِ حماقت الفاظ
ڈرتا ہوں میرا کہیں راز نہ افشا کر دے
اس کے لب سینے کی سوجھی ہے مجھے اک تجویز
اپنے لب اس کے حسیں ہونٹوں پہ رکھ دیتا ہوں
پیچھے ہٹ جاتا ہوں میں قدموں کی آہٹ پا کر
اپنی کُرسی پہ سمٹتا ہوا آ بیٹھتا ہوں

کٹھ پتلی کا ناچ

بوڑھے چُپ ہیں دیواروں سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے ہیں
عورتیں ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہیں بچّے چیخ رہے ہیں
بانکے، ہنس مکھ اور سجیلے کچھ لڑکے صف باندھے کھڑے ہیں
چُھپ کے محلّے کی چنچل دوشیزاؤں کو گھور رہے ہیں
بانسوں پر تان کے ریشمی چادر بارہ دری سی بنا لی ہے
اِک دھوم سے جس میں "پاٹے خاں" کی برات نکلنے والی ہے
پیار کے گیتوں کی دُھن ہے سیٹی کی صدا کی پروازوں میں
شرماتی ہیں کم سِن بہوئیں کھڑی ہوئی دروازوں میں

بھڑکیلے لباس میں رقصاں کٹھ پتلی تصویرِ مکمل ہے
مرضی کے مطابق جس کو نچانے والا نظر سے اوجھل ہے
ہر ایک اشارے پر مالک کے، پتلی ناچتی جاتی ہے
"اور آگے چلو، اور آگے چلو" کا دلکش نغمہ گاتی ہے
ہونٹوں پہ تبسّم کھیلتا ہے اور قہقہے گونجنے لگتے ہیں
گھونگٹ کی درازیں سمٹتی ہیں سب کے سر جھومنے لگتے ہیں
ہنستے ہیں مگر یہ علم نہیں وہ بھی سب کاٹھ کے پتلے ہیں
دیر سے شعبدہ گر کے ان دیکھے ہاتھوں میں ناچ رہے ہیں
وہ شعبدہ گر جو کھیل رہا ہے انسانی تقدیروں سے
انسان کے دل کی آشاؤں سے، جذبوں سے، تدبیروں سے
یہ دُنیا اور دُنیا کے فریبِ حسیں بھی ایسے مداری ہیں
صدیوں سے جن کے ہاتھوں میں انسان رقصاں کٹھ پتلی ہیں
ہر وقت نظر کے سامنے کاٹھ کے پتلے گھومتے رہتے ہیں
کچھ قہقہے گونجتے رہتے ہیں کچھ سر بھی جھومتے رہتے ہیں

خموشی

بُری طرح دلِ مغموم کو شکست ہوئی
کچھ اس ادا سے ہوئیں گنگ دھڑکنیں حس کی
بلند قامتیٔ آرزو بھی پست ہوئی
نحیف و زار ہے جنبش نگاہِ بے حِس کی
چمٹ گئی ہے سمٹ کر زبان تالو سے
گھنے ببول کے کانٹے ہیں گھونٹ سانسوں کے
نکل چکی ہے مری سوچ میرے قابو سے
خیال ذہن کے رُجحان پر نہیں چلتے

عجب خلش ہے مری پُرسکوں سا بیٹھا ہوں
میں آج کتنے بڑے خاکداں میں تنہا ہوں
فضا کی خامشی میں آج کوئی راز نہیں
نہ جانے آج میں کیوں سوچ ہی نہیں سکتا
مرے دماغ کا کوئی دریچہ باز نہیں
یہی گماں مجھے ہوتا ہے جی نہیں سکتا
جہاں میں آج مری کوئی اہمیت ہی نہیں
کسی کے پاس نہ میں آج اپنے دل کے پاس
ہوا کی مست خرامی میں کیفیت ہی نہیں
گماں مجھے یہی ہوتا ہے مر چکا احساس
مَیں چاہتا ہوں مجھے چیخ سی سنائی دے
کوئی قریب کی جھاڑی سے اک دُہائی دے

کل

رُوح کُش وہم وگماں، صبر شکن اندیشے
راستے میں مرے، فولاد کی دیواریں تھے
تُو نہیں جانتی میں کتنے بکھیڑوں کے بعد
تیرے پاس آیا تھا وعدے کا سہارا لے کر
ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے جو دیکھا ہوتا
تُو مرے زلزلۂ شوق سے لرزاں ہوتی
سمِ قاتل میں بُجھا تیر ہے یہ تیرا جواب
"جاؤ، ضد چھوڑ بھی دو، دق نہ کرو، کل ہاں کل"
سنتے ہی "کل" کا جفا کار، ستم پیشہ لفظ
خود کُشی کرلی ہے مچلے ہوئے ارمانوں نے
وہی دیواریں جنہیں توڑ کر آیا تھا مَیں
میرے رستے میں دوبارہ ہوئی جاتی ہیں بلند
مجھ میں اب ان کو گرانے کی بھلا تاب کہاں

کتنا دل سوز ہے یہ "کل" کا ستم پیشہ لفظ
خوف میں ڈھلتا ہوا وہم و گماں سے لبریز
سوچ تو آج بھی کل ہی تھا کوئی دم پہلے
کل کے اس دیوِ ستمگر کو تجھے کیا معلوم
کس طرح آج میں تبدیل کیا تھا میں نے
دیکھ یہ کل کا جفا کار، ستم پیشہ لفظ
کتنے آلام و مصائب کی جہاں میں ہے اساس
جھوٹ، اوہام، ریا، حرص، کفایت، لالچ
یہی کیا، ایسے کئی اور بھی افعالِ شنیع
کل کے خوف اور توہّم نے کئے ہیں پیدا
یہ حسیں خاک کی دنیا یہ فلک بوس محل
کل کی آفات ہی سے بچنے کے سامان تو ہیں
اپنے پاس ایسا مری جاں کوئی سامان نہیں!!
کل پہ کیوں چھوڑ دیں پھر آج کا لطف اور سرور

اشتباہ

میرے بالوں میں کومل اک ہاتھ سرکتا آتا ہے
روز یونہی اعلان ہوا کرتا ہے صبح کے آنے کا
لب پہ تبسّم لے کر وہ یوں مجھ کو جگانے آتی ہیں
ہاتھ میں اُجلا تولیہ لے کر جب میں نہانے جاتا ہوں
صابن، کنگھی، تیل وہاں پہلے ہی سے رکھے ہوتے ہیں
سب سے اچھا لباس بھی اک کھونٹی پہ ٹنگا ملتا ہے مجھے
بوٹ کے فیتے کسنے نہیں پاتا ہوں ابھی میں اچھی طرح
مکّھن، توس، پیالی چائے کی، میز پہ رکھدی جاتی ہے

میرے "کپ" میں اَوروں کی نسبت دودھ زیادہ ہوتا ہے
وہم یہی رہتا ہے انھیں میں کافی محنت کرتا ہوں۔
پاؤں ابھی رکھنے نہیں پاتا ہوں دروازے سے باہر
اندر سے آواز یہ آتی ہے، بہکی، گھبرائی ہوئی
"ٹھہرو، کہاں بھاگے جاتے ہو، اپنا قلم تو لیتے جاؤ"
شرم مجھے آجاتی ہے، میری نظریں جھک جاتی ہیں

•

دھیان سہارے سارا رستہ سوچتے ہی کٹ جاتا ہے
سوچتا ہوں میں یہ خدمت، ایثار، خلوص اور ہمدردی
سُست اور کاہل بنجیں اور ناکارہ کئے دیتے ہیں مجھے
اک دن اُن کو دفتر میں بھی ساتھ نہ لانا پڑ جائے
لمبے ترنگے جاٹ سے ٹکرا جاتا ہوں، گر پڑتا ہوں
ذہن نئی شہراہِ تخیّل پر دیتا ہے ڈال مجھے
سوچتا ہوں مَیں یہ خدمت، ایثار، خلوص اور ہمدردی
عورت کی فطری غلامی اور کمزوری کے مظہر تو نہیں

لیکن دل کو اور ہی کچھ اندیشے گھیرے بیٹھے ہیں
میرا دل — احباب کے دھوکوں میں جو کثرت سے آیا،
میرا دل — جس نے زہریلی محبت کو بھی اپنایا،
میرا دل — چوٹیں کھائی ہیں جس نے یگانوں کے ہاتھوں
سچّے پیار کو بھی اک مہلک پیار سمجھنے لگتا ہے

ساڑھے چار بجے جب دفتر سے گھر کو میں لوٹتا ہوں
ہنستا مکھڑا دروازے میں استقبال کو آتا ہے
میرا ذہن مجھے پھر کوسوں دُور اُڑا لے جاتا ہے
میں اتنا ناکام، اتنا مجبور، اتنا بد قسمت ہوں
دل سے خوشی بھی جانے کیوں برداشت نہیں ہو سکتی ہے
سوچتا ہوں ایک اور نئی آفت آنے والی تو نہیں

بازار

مجھے تم روز کہتی تھیں چلو بازار ہو آئیں
مرے انکار پر چہرہ اُتر جاتا تھا نکھرا سا
تمہارے پھر یہ طعنے کس قدر دِلدوز ہوتے تھے
"پڑے رہتے ہو گھر میں عورتوں کی طرح سارا دن
تمہیں کیا شرم آتی ہے مجھے ہمراہ لے جاتے؟"
خدا کا شکر ہے مَیں آج یہ الفاظ سنتا ہوں
"مری توبہ!! کبھی بازار بھولے سے نہ جاؤں گی
خدا غارت کرے، سب گھورتے تھے بھُو کی نظروں سے

وہ لڑکا ہُو بہُو بندر تھا اس کو موت آجائے
مجھے مُڑ مُڑ کے جو تکتا تھا اور آنکھیں جھپکتا تھا
مرا جی چاہتا ہے لُچّے کا مُنہ نوچ لُوں جا کر"

نہ بگڑو تھک چکی ہو سانس لے لو، بیٹھ تو جاؤ
ذرا سی بات پر ہو اس قدر برہم مجھے دیکھو
ہزاروں زخم اپنے قلب پر میں کھا کے آیا ہوں
تڑپ اک دل میں پیدا ہے مگر خاموش بیٹھا ہوں
ادھر آؤ تمہیں انکار کی میں وجہ سمجھاؤں
دُکاں وہ تم نے دیکھی تھی جہاں اخبار بکتے ہیں
اُسی کے پہلو میں کُبڑا سا اک حلوائی بیٹھا تھا
تمہیں میں نے دکھایا تھا کہ اس نے کس صفائی سے
کڑھائی میں سے گھی کی ایک مُردہ چوہا پھینکا تھا
تمہارا جی تو متلاتا رہا تھا چند لمحوں تک
سپاہی تم نے دیکھا تھا جو اک مزدور لڑکے پر

تڑا تڑ گولیاں برسا رہا تھا اپنے ہنٹر سے
منڈھی تھی جس کے سر پہ یہ بلا اک چاٹ والے نے
کہ اس کے چھیبے میں سے اس نے دو پیسے اُٹھائے ہیں
تلاشی لینے پر اک پھوٹی کوڑی بھی نہ نکلی تھی
تمہیں اس لڑکے کی حالت پہ کتنا رحم آیا تھا
سمجھتی ہو کہ کیوں تفریح کی عادت نہیں مجھکو
ہمارے شہر کا ہر موڑ، ہر بازار، ہر نکڑ
بھیانک اور لرزہ خیز منظر پیش کرتا ہے
نہ بگڑو، تھک چکی ہو، سانس لے لو، بیٹھ تو جاؤ

فروگذاشت

آج کی رات ہمیشہ کو بچھڑنا ہے ہمیں
اور ابھی تیرگیٔ بخت سے لڑنا ہے ہمیں
طعن و تشنیع کے لیے کاش فلک سیر پہاڑ!
عشق کی جرأتِ بیباک سے ہم دیتے اُکھاڑ
پھاند جاتے غم و آفات کے ندّی، نالے
کاش اُڑا سکتے ہم اُمڈے ہوئے بادل کالے!
وقت بھی سینے کے داغوں کو نہیں دھو سکتا
رونے سے، اب مری جاں!! کچھ بھی نہیں ہو سکتا

(عمر بھر کے لئے غمگیں ہمیں رہنا ہو گا
ظلم و بیداد کو ہنستے ہوئے سہنا ہو گا
غم نہ کر خود کو اگر آگ میں جھونکا ہم نے
اپنے اقدام کا انجام نہ سوچا ہم نے
تو سمجھدار ہے اتنا مجھے بتلا تو سہی
(بنی آدم نے تدبّر سے لیا کام کبھی؟
سُن اگر شاہجہاں صاحبِ جبروت و جلال
کرتا غیروں کو نہ اسبابِ تجارت سے نہال
لکھی جاتی نئے عنوان سے رودادِ وطن
اتنا برباد و خزاں رنگ نہ ہوتا یہ چمن
عقل و دانش کے ہمیں کتنے ہی ایسے اقدام
آج آتے ہیں نظر ایک بھیانک الزام
اب نہ رو، خود کو اگر آگ میں جھونکا ہم نے
اپنے اقدام کا انجام نہ سوچا ہم نے

بھوکی جوانیاں

چھڑے ہوئے ہیں قیامت کے جانفزا موضوع
سڑک کے پاس جنھیں سُن رہے ہیں غور کے ساتھ
تمام دوست جواں سال اور جواں اطوار
وطن کے صدیوں کے خوابِ جمیل کی تعبیر
لبوں پہ جن کے ہے کچھ ایسے تجربوں کا بیاں
جھلک رہی ہیں مکمل جوانیاں جن میں

درست کرتے ہوئے ٹائی کی گرہ کا کساؤ
نظر سے لیتے ہوئے جائزہ نشستوں کا
حفیظ گویا ہوا اپنے کندھے جھٹکا کر
"یہ کل کی بات ہے، میں آرہا تھا دفتر سے
گلی کے موڑ پہ رزّاق کی دُکان کے پاس
خریدتی ہوئی "کانجی کے بھلّے" اک لڑکی
مجھے ملی، ہنسی اور گھورتی ہوئی چل دی
میں جانتا ہوں وہ جس گھونسلے کی چڑیا ہے
مگر ہے اس کی گلی چیونٹیوں کے بِل کی طرح
مجھے اُمید بر آتی نظر نہیں آتی"

"کوئی سبیل نکل آئے گی نہ گھبراؤ"
دلاسہ دیتے ہوئے شوخ سیموئیل نے کہا

"نگاہ کل سے ملاتا نہیں میں بیوی سے
اک ایسی حرکتِ بے جا سے شرمسار ہوں میں
مرے مکاں کے مقابل ہے ڈاکٹر کا مکاں
غریب سات جواں لڑکیوں کا ابّا ہے
پیامِ موت ہے اس کے لئے شباب اُن کا
برادری میں کمی تو نہیں ہے لڑکوں کی
نظر میں اُن کی مگر بیاہ اک تجارت ہے
یہ کل کا ذکر ہے بارش کے بعد شام کے وقت
کھڑا ہوا تھا میں چھجّے پہ ہاتھ رکھے ہوئے
ہوا کے جھونکے تھے ہلکے سرور کی لہریں
کھڑی تھی سامنے اس ڈاکٹر کی اک لڑکی
نہ جانے کیا مجھے سوجھی اشارہ کر بیٹھا
وہ نیچے اُتری کسی قسم کی جھجک کے بغیر

مرے مکاں میں لپکتی ہوئی چلی آئی
مگر ٹھٹھک گئی بیوی کو دیکھ کر میری
میں چاہتا تھا کہ اے کاش اس گھڑی بیوی
سلائی سیکھنے ہمسائی کے گئی ہوتی"

"تو کل کی شام سے روٹھی ہوئی ہیں بھابی جان"
پدم نے اپنے فسانے کا یوں کیا آغاز
"مرے بھی ساتھ کل ایسا ہی واقعہ گزرا
کمر کے درد سے بے چین تھے بڑے بھائی
حکیم جی نے دیا مشورہ جو مالش کا
ہم ایک تانگے پہ بازار میں سے گھر لوٹے
سیاہ تختہ پہ لکھا ہوا تھا "مالش گھر"
طویل کمرے میں چھ سات چھوٹے کمرے تھے

جنہیں سنایا گیا تھا دبیز پردوں سے
تھی ایک صوفے پہ طرّار بڑھیا نیم دراز
ہمارے داخلے پر مُسکرا کے اُٹھ بیٹھی
معاملہ ہوا طے، گھنٹی زور سے گونجی
دبیز پردے ہلے، پھڑپھڑائے اور اُٹھے
نگاہِ شوق کی حیرت کی انتہا نہ رہی
جب اس نے سامنے جلووں کو ضَو فگن دیکھا
ہر ایک عمر ہر اک رنگ کے حسین جلوے
"پسند کیجئے ـــــ کس سے کرائینگے مالش؟"
کہا ذرا سے توقّف کے بعد بُڑھیا نے
یہ سننا تھا کہ بڑھے بھائی سیڑھیوں کی طرف
تمام رات یہی آرزو رہی اے کاش
اکیلا ہوتا میں اِن مہ وشوں کے جھُرمٹ میں

چھڑے ہوئے ہیں قیامت کے جانفزا موضوع
سڑک کے پاس جنہیں سُن رہے ہیں غور کے ساتھ
تمام دوست، جواں سال اور جواں اطوار
وطن کی فوجِ جواں عزم کے جواں جرنیل
غلام، غم زدہ، بھوکی جوانیاں جن کی
یہ چاہتی ہیں کہ آزادیٔ نفس کی بجائے
تمام لعنتِ دُنیا وطن پہ چھا جائے
فجور و فسق کے مسدود راستے کھُل جائیں
نویدِ عشق لئے حُسن صبح و شام پھرے

تلاش

ریت پر ڈھونڈنے آیا ہوں وہ قدموں کے نشاں
میرے اور تیرے حسیں سایوں نے چھ سال ہوئے
ساحلِ بحر کے سینے پہ بنایا تھا جنہیں
ڈھونڈنے آیا ہوں اُن گیتوں کی میٹھی تانیں
ہم نے مِل جُل کے بڑے شوق سے گایا تھا جنہیں

دیکھ پانی کے تموّج کی طرف غور سے دیکھ

اُٹھ رہا ہے یونہی طوفان مرے سینے میں
دیکھ چھوٹے بڑے پھیلے ہوئے قدموں کے نقوش
ساحلِ بحر کے سینے پہ ہیں یوں بکھرے ہوئے
جیسے دل پر غم و آلام کے چرکوں کے نشاں
دیکھ بپھری ہوئی امواج کا رقصِ بسمل
اپنے قدموں کی طرح ان کے نقوشِ کفِ پا
وقت کے ہاتھوں سے بے وقت مٹے جاتے ہیں
کل کوئی آنکھ جنہیں دیکھ نہ پائے گی کہیں
سُن ہمارا ابھی کوئی گیت ہے انکے لب پر
کسی مجروح مغنّی کی طرح موجوں کو
نغمہ و شعر طرازی کی نہیں ہے فرصت
ایک بھی گیت انہیں یاد نہیں رنج نہ کر
یاد رکھتا ہے بھلا کون پُرانے قصّے

اپنی بات اور ہے — ہم نے تو محبت کی ہے
اور ہم بھول کہاں سکتے ہیں اس ساحل کو

انھیں قدموں کے نشانوں سے ذرا بچ کے چلیں
چاہتا ہوں کہ مری طرح اگر کوئی غریب
یہ حسیں نقش یہ بہتی ہوئی اُلفت کے نشاں
ڈھونڈنے آئے تو ناکام نہ واپس جائے
ہم بھلا کیسے کچل سکتے ہیں یہ نقشِ جمیل
ہم ستم دوست نہیں، ہم نے محبّت کی ہے
چلو قدموں کے نشانوں سے ذرا بچ کے چلیں

سُوکھے ہوئے پتّے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا نگہِ آوارہ
دُور و نزدیک کا کرتی ہوئی سرعت سے طواف
آج کیوں بوڑھے سے اک پیڑ پہ سستاتی ہے
کھوکھلا، بوڑھا سا، بیڈول سا، مریل سا درخت
بڑی مشکل سے جو کاٹے گا بس ایک اور خزاں
کتنے ہمدرد و وفادار ہیں سُوکھے پتّے
پیڑ کے بازوؤں سے چمٹے ہوئے ہیں جو ہنوز
جن کا انجام ہے بس ایک ہوا کا جھونکا
تازگی چاہے کسی چیز میں ہو نعمت ہے
انھیں پتّوں کو تھپکتے تھے ہوا کے ریلے

جانے کیوں یاد دلاتے ہیں یہ سُوکھے پتّے
مجھے ماضی کے صحیفے کے مصوّر اوراق
نقش ہیں ذہن و تصوّر پہ مرے جن کے حروف
جن کی دم توڑتی کجلائی ہوئی تابانی
اب بھی تنہائی کی راتوں میں بھڑک اُٹھتی ہے
کبھی تنہائی کی راتیں بھی تھیں شاداب و جمیل
جن میں اب رنگ و ضیا کا نہیں پرتو کوئی
آج ماضی کی ہر اک تابش و رنگینی پر
وقت کے ہاتھ ہیں اک عرصہ سے مصروفِ ستم
چند سال اور بس اب کاٹے گا مشکل سے شباب
اب مری شاخِ تمنّا میں ہیں سوکھے پتّے
جن کے جھرمٹ میں نہیں خرمنِ ہستی محفوظ
جانے کیوں، پھر بھی ہے لپٹا ہوا ماضی مجھ سے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ فلک سیر نگاہ
آج کیوں بوڑھے سے اک پیڑ پہ سستاتی ہے

گریز

جی میں یہ ٹھان کے بھاگا تھا تری باہوں سے
کہ نہ آؤں گا کبھی لوٹ کے ایواں میں ترے
دُور جا پہنچا تھا میں تیری گذرگاہوں سے
سوچا تھا، پاؤں نہ رکھوں گا شبستاں میں ترے
ایک زنداں نظر آتی تھی محبّت مجھکو
پھر ترے قدموں میں لے آئی ہے قسمت مجھکو

کیا بتاؤں تجھے کس درجہ پشیماں ہوں میں
سوچتا ہوں کہ یونہی عمر گنوا دی مَیں نے
آج ساون کی گھٹاؤں سا پریشاں ہوں میں
غم یہ ہے خود کو بڑی سخت سزا دی میں نے
میں سمجھتا تھا کہ دل اپنا میں بہلاؤں گا
کیا خبر تھی مجھے میں اپنے کو دھوکا دوں گا

سینے میں، بانہوں میں، زلفوں میں، چھپا لے مجکو
انقلاباتِ جہاں مجکو یہاں دیکھ نہ لیں
غم و حرماں کے نہنگوں سے بچا لے مجکو
یہ ستمگر کہیں تیرا بھی مکاں دیکھ نہ لیں
خود کو ادبار کے پنجے سے چھڑا لایا ہوں
ہانپتا کانپتا قدموں میں ترے آیا ہوں

میں نے دیکھے ہیں وہ آلام بچھڑ کر تجھ سے
جنہیں سنتے ہی اڑینگے ترے ہوش اور حواس
کاٹے ہیں سوگ میں ایّام بچھڑ کر تجھ سے
مجھے ڈر ہے کہیں دل تیرا نہ ہو جائے اُداس
مَے اُبلتا ہوا زہر آب بنی تیرے بغیر
زندگی تشنہ و ناکام کٹی تیرے بغیر

مَیں نے یہ دیکھا کہ بک سکتا ہے جسم اور شباب
مَیں نے یہ دیکھا کہ دَولت ہے خدائے عالم
جس کی کثرت ہے ثواب اور کمی جس کی عذاب
ایک نادار کی اُلفت بھی نہیں ہے محکم
کئی معنی ہیں محبّت کے یہ دیکھا مَیں نے
کئی ساماں ہیں ہلاکت کے یہ دیکھا مَیں نے

سینے میں، باہنوں میں، زُلفوں میں چھپالے مجکو
انقلاباتِ جہاں مجکو یہاں دیکھ نہ لیں
غم و حرماں کے نہنگوں سے بچالے مجکو
یہ ستمگر کہیں تیرا ابھی مکاں دیکھ نہ لیں
ہانپتا، کانپتا آیا ہوں پکڑ لے مجکو
اپنی آغوش کے زنداں میں جکڑ لے مجکو

بچارے ماں باپ

یہ ترے بچّے تری گود کی آرائش ہیں
تو بڑے پیار سے رہ رہ کے انھیں چومتی ہے
اور ہیں عمر درازی کی دعائیں لب پر
تو اُنھیں چومتی ہے اور مَیں اس سوچ میں ہوں
ہم ستم کار ہیں، بے رحم ہیں اور مجرم ہیں

ہم نے اُمّیدوں کا خوں ہوتے ہوئے دیکھا ہے
رائیگاں جاتے ہوئے دیکھے ہیں عزم اور اقدام

آہیں بھرتی ہوئی دیکھی ہے خدا کی مخلوق
بھوک سے مرتی ہوئی دیکھی ہے نسلِ آدم
ہم نے دیکھی ہیں بگڑتی ہوئی تقدیریں بھی
جوش و ایقان پہ چھاتے ہوئے دیکھا ہے جمود
ہم نے گرتی ہوئی دیکھی ہیں عبادت گاہیں
کند ہوتی ہوئی دیکھی ہیں چمکتی تیغیں
ہم نے لگتے ہوئے دیکھے ہیں زباں پر تالے
ہم نے پایا ہے غم و یاس سے لبریز جہاں
پیار، بچھڑی ہوئی ترسی ہوئی روحوں کا ملاپ
کم تو کر سکتا ہے افکار و الم کی شدت
لیکن آلام کو برباد نہیں کر سکتا
گود میں مادرِ قدرت کی بھی دیکھا ہم نے
نہیں ملتی ابدی اور مکمل تسکین
ہم نے پایا ہے ہر اک قلب کو غم سے معمور
حلق میں قہقہے بھی گھٹتے ہوئے دیکھے ہیں

ہنستے چہروں میں جھلکتا ہوا دیکھا ہے ملال
ہم نے پایا ہے غم و یاس سے لبریز جہاں

یہ سمجھتے ہوئے بھی ہم نے حماقت کی ہے
تین معصوم سی روحوں پہ ستم ڈھایا ہے
انھیں بھی پستیٔ مکروہ پہ لا پٹکا ہے
تو بڑے پیار سے ن ن کے انھیں چومتی ہے
اور میں سوچتا ہوں کتنے گنہگار ہیں ہم

تباہی

میری تاریخِ وطن، رنج فزا، شر انگیز
جس کے اوراق پر انسان ہے سرگرمِ ستیز
حرص کی آگ سے معمور، ریا سے لبریز
اپنے من مانے عزائم پہ جسے ڈھالا ہے
مستبد نظمِ حکومت کے قلمدانوں نے

آج میں ڈھونڈتا ہوں قلب کے اسبابِ جنوں
آج یہ سوچتا ہوں کیوں مَیں ہوا خوار و زبوں
کس کے ہاتھوں سے لُٹا میرے مقدر کا سکوں
آج ان صفحوں میں کرتا ہوں حقیقت کی تلاش
چھین لی میری خوشی چند ستم رانوں نے

ایک صفحے پہ "سنجگتا" نظر آتی ہے مجھے
دل کی اُفتاد حکایات سناتی ہے مجھے
"پرتھوی راج" کا انجام دکھاتی ہے مجھے
سوچتا ہوں مری عظمت کو کیا ہے برباد
فرض کی راہ سے بھٹکے ہوئے دیوانوں نے

اور اک صفحے پہ مَیں دیکھتا ہوں "نورجہاں"
سرو قد، سیم تن و ماہ جبیں، شوخ، جواں
"شیر افگن" سے دلاور کی تباہی کا نشاں
میری تاریخِ وطن خون سے رنگیں کر دی
حسن کی شمعِ ضیا بار کے پروانوں نے

نظر آتی ہے مجھے ایک ہی بنیادِ فساد
جس کے ہاتھوں سے ہوئی دل کی مسرّت برباد
لبِ اوراق پہ رقصاں ہے یہی اک فریاد
یعنی عورت کی دہکتی ہوئی تخلیق کے بعد
منہ سکوں کا نہیں دیکھا کبھی انسانوں نے

افواہ

یہ تو سچ ہے نہیں تجھ سا کوئی نازک اندام
تیری تعمیر بھی کمزور، عقیدے بھی نحیف
سنی ہیں تو نے مگر کس سے یہ اُلٹی باتیں
تُو نے یہ کس سے سنا ہے کہ تباہی افلاس
ہم پہ کی ہیں سبھی آفات خدا نے نازل
تو بتا سکتی ہے وہ کونسا ایسا ہے گناہ؟
اتنی سنگین سزا جس کے عوض دی ہے ہمیں
ہم زمانے سے زیادہ تو گنہگار نہیں
جس کی دولت میں ہیں شیطان کی مذموم صفات
ہمیں کیوں دہر میں ہیں اتنے تباہ و برباد

تو نہیں جانتی یہ پیچ، یہ خم، یہ اُلجھاؤ

تُو ہے اک مشرقی عورت کا مثالی کردار
ابھی دیکھے ہی نہیں تُو نے سیاست کے طلسم
گھر کے دھندوں ہی سے فرصت نہیں ہوتی ہے تجھے
یہ غلط تُو نے سنا ہے کہ تباہی افلاس
ہم پہ کی ہیں سبھی آفات خدا نے نازل
ایسی تعلیم تو دی ہے ہمیں ان لوگوں نے
ابتدا ہی سے پنپنے نہیں دیتے جو ہمیں
چاہتے ہیں جو ہمیں دیکھنا ہر وقت ذلیل
جن کی دولت ہے ہماری ہی مشقّت کا ثمر
جن کے سامانِ تعیّش کے مصارف کے لئے
آئے دن فاقوں کی رہتی ہے گھروں میں نوبت
ابتدا سے جو ہمارے ہی لہو پر پل کر
ہمیں پر ذلت و بیداد روا رکھتے ہیں
یہ غلط تُو نے سنا ہے کہ تباہی افلاس
ہم پہ کی ہیں سبھی آفات خدا نے نازل

دھمکی

جادۂ زیست کا ہر ہر قدم اک عبرت ہے
بند آنکھوں سے کئے جاتا ہوں طے راہِ حیات
آنکھیں کھولوں گا تو اک چوٹ لگے گی دل پر
خون میں لتھڑی نظر آئے گی جنگاہِ حیات
میری جاں! جاگنے پر تُو مجھے مجبور نہ کر
پُر فضا دل کو مرے رنج سے معمور نہ کر

رکھ نہ اُفتادِ طبیعت سے ابھی باز مجھے
میری بیداریٔ احساس ستم ڈھائے گی
دیکھ کر اپنی حقیقت کی برہنہ تصویر
یہ سمجھ لے کہ مجھے موت ہی آجائے گی
غارتِ زیست نہ ہو جائے ہدایت تیری
ابھی بیہوش ہی رہنے دے فراست میری

دھمکیاں ترکِ کرم کی نہ ابھی دے مجکو
ذلّتِ عشق کا عرفان قیامت ہو گا
مجھ سے دیکھی نہیں جائے گی غلامی اپنی
جس کا انجام محبّت کی ہلاکت ہو گا
بس مری جاں!! مرے احساس کا فتنہ نہ جگا
ابھی سے آگ نہ ایوانِ دو عالم میں لگا

کچھ تو سنو!!

سالہا سال سے گھلتا ہے فضا میں زہراب
دور و نزدیک سے آوازیں چلی آتی ہیں
تلخیٔ زیست کا پٹتا ہے ڈھنڈورا جن میں

سرِ رہ پھیلے ہوئے دامنِ تذلیل وطلب
"بھوکے محتاج کی حالت پہ ترس کھا بابا!!"
راستہ روکے سرِ شام انوکھے تاجر
"کیا کوئی مال نیا کورا دکھاؤں صاحب"
دیو قد، رستم و سہراب بدن، پیکِ اجل
"سود ابی لے گا، خو ہم اپنا روپی پرِ لیگا"
شغل و تفریح کے رنگین سے دامِ تزویر
"دس روپے، پتے ذرا پھینٹ لو، تگّی پھینکو"
ہر طرح لیتی ہوئی دادِ عروسِ جدّت

"مرغ اور گولڈ ربن، سب کے ہوئے سات روپے"
روح افگار غلامانہ تفاخر کی نمود
"ڈبو ڑھا درجہ ہے کہاں بھاگے چلے آتے ہو"
مُزدِ غیوّر میں آمیزشِ دریوزہ گری
"اور ایک آنہ دو سر کار گراں ہے گندم"
ذلّت آموز، تواں سوز گھروں کے مکتب
"ہوّا آجائے گا، بستر میں دبک کر سو جاؤ"
مفلسی، فاقہ کشی، قابلِ تعذیب و سزا
"چور نوکر ہو، نکل جاؤ، نہ آنا کل سے"
ہر دکاں جیب کترنے کا حسیں ہتھکنڈہ
"اور سے تین روپے آپ سے دو لے لینگے"
آمرّیت کا ستم خانہ حکومت گھر کی
"بہو کیوں ہاتھ پہ پھر ہاتھ دھرے بیٹھی ہو"

دور و نزدیک سے آوازیں چلی آتی ہیں
تلخیٔ زیست کا پٹتا ہے ڈھنڈورا جن میں

حق و باطل

سچ بہت تُرش ہے تو کر نہ سکے گی برداشت
اپنے چہرے کے خد و خال کی بے رنگی پر
جھوٹ کا شوخ ملمع ہی چڑھا رہنے دے
سچ کے جملے نہ کہیں قطعِ تعلّق بن جائیں

ہر حقیقت تو پُر انوار نہیں ہوتی ہے

جھوٹ دلچسپ، دلآویز، جمیل اور رنگین
جس نے میرے ترے رشتے کو کیا مستحکم
آج اس جھوٹ کا بن جاؤں میں قاتل کیونکر
اپنے چہرے کے خد و خال کی بے رنگی پر
جھوٹ کا شوخ ملمّع ہی چڑھا رہنے دے
زندگی اپنی مسرّت سے کٹی جاتی ہے
تیری ضد کچھ بھی سہی، بات بنی رہنے دے

تُو نہیں مانے گی چاہے ترے ٹکڑے ہو جائیں
آجتک تُو نے گنوایا نہیں اس ضد کا وقار
تیری مرضی جو یہی ہے تو مَیں حسبِ معمول

آج بھی تیری ہی ضد پوری کیئے دیتا ہوں
آج ہر جھوٹ کا مَیں خون کیئے دیتا ہوں

آئینہ سامنے ہے اس میں ذرا شکل تو دیکھ
کیا ترے چہرے کے کُملائے ہوئے نقش و نگار
ویسے ہیں جیسے کبھی میں نے سراہا تھا انھیں؟

آمرے ساتھ ذرا اپنا یہ کندھا تو ملا
یہی وہ قد ہے جسے سرو سے دی تھی تشبیہ؟

چار سو بکھرے ہوئے کپڑوں کے انبار تو دیکھ
اسی کا نام ہے کیا حُسنِ سلیقہ مندی؟
یوں نہ رو میں نے تو پہلے ہی کہا تھا تجھ سے
سچ بہت ترش ہے تو کر نہ سکے گی برداشت
ابھی تو ایسے کئی اور حقائق بھی ہیں
جنہیں مَیں لا نہیں سکتا ہوں زباں پر اپنی

اصل میں آ بھی نہیں سکتے حقائق لب پر
تیری آنکھوں میں یہ آنسو نہیں دیکھے جاتے
اُٹھ مری جان! کہ غصّے میں ہر انساں اکثر
ایسی ہی قلب شکن باتیں کیا کرتا ہے
تجھ سی خوش رنگ خوش اطوار زمانے میں نہیں
کوئی دیکھے تو سہی میری نگاہوں سے تجھے

جیو تسی

بیچتا ہے سرِ رہ بیٹھا ہوا اپنا کمال
راکھ ہے پیسی ہوئی، بالوں کے ہر گچھے میں،
گورے ماتھے پہ ہیں رنگین لکیروں کے نشاں
جیسے جاپان کے ریشم کا چمکتا ٹکڑہ
لکڑی کے منکوں کی گردن میں ہیں کچھ مالائیں

بھیس بدلے ہوئے پُر رُعب رشی مُنیوں کا
کھولتا ہے سرِ رہ بیٹھا ہوا شان کے ساتھ
حال، مستقبل و ماضی کے نہفتہ اسرار
چار تانبے کے چمکتے ہوئے ٹکڑوں کیلئے

عرصۂ دہر کے آلام سے گھبرائی ہوئی
بھوکی، ناکام، ملول اور پریشاں مخلوق
زرد رخساروں، تھکے چہروں، بجھی آنکھوں میں
غمِ اُلفت، غمِ اولاد، غمِ محرومی
ایسی کتنی ہی علامات کے انبار لئے
چھپتی، ڈرتی، چلی آتی ہے ہتیلی پھیلائے
محض اپنے دلِ بے صبر کی تسکیں کے لئے
ورنہ ہاتھوں کی لکیروں میں خزانے تو نہیں

بیچتا ہے سرِرہ بیٹھا ہوا شان کے ساتھ
خواب بدمست جوانی کی حسیں راتوں کے
بیچتا ہے سرِ رہ دولت و اولاد کے ڈھیر
چار تانبے کے چمکتے ہوئے ٹکڑوں کے لئے
کتنا جاں بخش ہے رنگین فریبِ تقدیر
اس کی روزی کا جو سامان بنا جاتا ہے
دل ہوئے جاتے ہیں لبریزِ اُمیدِ موہوم

بیچتا ہے سرِرہ بیٹھا ہوا شان کے ساتھ
بیم و اُمّید کے کچھ ایسے جفا پیشہ خیال
جنہیں اپنا کے فنا جوہرِ ہستی ہو جائے
زندگی جن سے مقدّر کا سہارا ڈھونڈے

زندگی میں نہ رہے جن سے تگ و تازِ عمل
اور مسدود گذرگاہِ ترقّی ہو جائے
بیچتا ہے سرِ رہ شہد سے میٹھی باتیں
یعنی تقدیر کے زہراب کے کچھ ایسے جام
کام جن پر کوئی تریاق نہیں کر سکتا

تکشلا کے کھنڈر

دیدۂ شوق میں حیرت کے تلاطم کو لئے
اپنی تہذیبِ گذشتہ کے کھنڈر دیکھتا ہوں
تکشلا خستہ و برباد، تبہ حال زمیں
کبھی اک سب سے بڑی درس گہِ انساں تھی
جس کی زرخیز و حسیں خاک سے اٹھّے ہونگے
مصلحِ قوم، جواں فکر، فسوں کار ادیب
آج ہے عظمتِ رفتہ کا شکستہ سا وجود

جس کے پس ماندہ نشاں میں ہیں نمایاں سب سے
بُدھ سے پیغمبرِ جاں بخش کے پُرہیبت بُت
شکل و صورت میں جواں ساحرہ، قامت میں پہاڑ
جن سے ہیں سنگ تراشوں کے خیالات عیاں
موہنی شکل ہے کردارِ درخشاں کی دلیل
اور قامت سے ٹپکتا ہے عزائم کا عروج
بُت نہیں ہیں، یہ ہیں اظہارِ پرستش کا کمال

آج بھی دہر کے مٹتے ہوئے آثاروں میں
کئی اقسام کے ہیں بُت ہی نمایاں سب سے
ذہن و افکار میں پیدا ہیں خیالات کے بُت
دل میں بیٹھے ہوئے مِل جائیں گے خوشرنگ صنم
لئے جاتے ہیں جو انساں سے پرستش کا خراج

اور انسان کا یہ جذبۂ اصنام پرست
اپنے اصنام کو جاوید بنا دیتا ہے
اونچی دیواروں پہ آویزاں حسیں تصویریں
نصب سڑکوں پہ یہ آبا کے وجودِ سنگیں
یہ عمارات، یہ قلعے، یہ محل اور یہ چمن
دستِ انساں کے تراشے ہوئے بُت ہی تو ہیں
ذہن و دِل کے جو حجابوں سے نکل آئے ہیں
جنہیں کل آدم و حوّا کی نئی اولادیں
اپنی تہذیبِ گذشتہ کا نشاں سمجھیں گی
جس طرح آج مرا دیدۂ اصنام پرست
رنگِ حیرت کے تلاطم کو جلو میں لے کر
اپنی تہذیبِ گذشتہ کے کھنڈر دیکھتا ہے

سخت جاں

مآلِ زیست ابھی اچھی طرح خراب نہیں
ابھی فسانۂ غم میں لہو کا رنگ نہیں
تباہیِ دل و جاں کا ابھی شباب نہیں
ابھی میں اپنی حیاتِ حزیں سے تنگ نہیں
ابھی رگوں میں اُبلتی ہوئی شراب نہیں
نگاہ تابشِ داغِ جگر سے دنگ نہیں
مذاقِ زیست بھی حسبِ نظر بلند نہیں

خیال و عزم کے حربوں میں کوئی جنگ نہیں
ابھی زیادہ ستایا نہیں گیا ہوں مَیں
ابھی تو چہرے کے تیور بھی شعلہ رنگ نہیں
جَلا جَلا کے تپایا نہیں گیا ہوں مَیں
ابھی نگاہ میں اپنی مَیں وجہِ ننگ نہیں
ابھی نظر سے گرایا نہیں گیا ہوں مَیں
ابھی لبوں پہ تبسّم ہے زہر خند نہیں
ابھی شعور کو عرفانِ خوب و زشت نہیں
فریب ہے جسے قسمت سمجھ رہا ہوں مَیں
جنونِ خام کو تمیزِ سنگ و خشت نہیں
ستم کو تیری عنایت سمجھ رہا ہوں میں
ملک نفس ہوں ابھی میں ریا سرشت نہیں
عذاب کو تری رحمت سمجھ رہا ہوں مَیں
مَیں صلح جُو ہوں ابھی مَیں وغا پسند نہیں

مرے حواس پہ ایسی شدید ضرب لگا
وفورِ کرب و اذیّت سے مَیں پکار اُٹھوں
جھنجوڑ کر مجھے خوابِ گراں اثر سے اُٹھا
لگا وہ ضرب کہ میں حشر در کنار اُٹھوں
کچھ اس طرح مری تعمیر کے پرخچے اُڑا
مَیں زخم کھا کے گروں گر کے کامگار اُٹھوں
ترا ستم تو ابھی قابلِ گزند نہیں

تضاد

ہوئی تحسین نگاہوں کے تصادم سے بلند
"دیکھ اسحاق!! چٹکتی ہوئی شفّاف کلی"
سُن کے پنواڑی نے پہنچایا سماعت کو گزند
"نوجواں مرہی تو جاتے ہیں بُری ہو کہ بھلی"
گالیاں بن گئے گاہک کے بگڑتے تیور
"بوڑھا، ناکارہ، کہن سال، اپاہج، پتّھر"

چھالیہ پیس کے دانتوں میں ہنسا پنواڑی
"کیوں مہابیر!! جوانی میں تھے ہم کتنے سریپ[1]
اک یہی عیب تھا پیتے تھے کسیلی تاڑی
داگ[2] کی گجلیں سناتا تھا ہمیں پی کے حنیپ[3]"

×

برتری اپنی دکھانے کا جوانی کو جنوں
"ایک سو بیس روپے سوٹ پہ لاگت آئی"
ایک چبھتی ہوئی سی طنز قدامت کا فسوں
"اجی ذلّت کی نشانی ہیں یہ کالر ٹائی
ہمیں پیارا ہے بزرگوں کا پُرانا فیشن
چُست پاجامے پہ شبرنگ چمکتی اچکن"
پھر شبِ رفتہ کی دعوت پہ ہوئی نقد و نظر

---

[1] شریف ۔ [2] مرزا داغ دہلوی ۔ [3] حنیف

"کتنا خوش ذائقہ تھا آلو مٹر کا بھرتا"
سنتے ہی بھڑک حسیں ساری سرِ راہگذر
"آلو کے بھرتے پہ چٹخارے، ندیدہ، بھوکا"

زرگری بوالہوسی، علم و ادب سے بیزار
"وقت کھوتے ہو کتابوں میں کوئی کام کرو"
علم یوں قوّت و سرمایہ سے محوِ پیکار
"سنبھلو، سنبھلو، بنی آدم کو نہ بدنام کرو"
کہیں رُوکھی سی پسند، اور کہیں پھیکا سا مذاق
ہر تباہی کی بنا رنگِ طبیعت کا نفاق

واپسی

شہر کا شور و شغب نغمۂ بے رنگ ہے آج
تھکی ہاری ہوئی، مرجھائی ہوئی آبادی
اپنے زر کار لباسوں میں بھی دلچسپ نہیں
جگمگاتی ہوئی سڑکیں بھی نہیں خلدِ نظر
آج ہم دور بہت دور نکل جائیں گے
دیکھ گنجان درختوں کی تھرکتی شاخیں

چھیڑتی ہیں کوئی رنگین سرودِ رفتہ
آج ہم دُور بہت دُور نکل آئے ہیں
گاؤں کے کھیت ترو تازہ، جوان اور جمیل
دعوتِ رقص کا پیغام بنے جاتے ہیں

انہی کھیتوں کی منڈیروں پر ذرا سستا لیں
دیکھ یہ بولتا ماحول، سکوتِ گویا
دل سے سرگوشیاں کرتا نظر آتا ہے مجھے
دیکھ، تہذیب کے پھیلے ہوئے لمبے پاؤں
ان منڈیروں کی حدوں سے ہیں بہت دُور ابھی
ان منڈیروں میں سکوں آج بھی مل سکتا ہے
نوعِ انساں غم و آفات سے بچ سکتی ہے
لیکن ان باتوں کی گہرائی تجھے کیا معلوم

پاؤں اُٹھے ہوئے یکلخت نہیں مُڑ سکتے

دیکھ انسان کی فطرت میں تلوّن کا ہجوم
دل کبھی ایک ہی مرکز پہ نہیں رُکتا ہے
کل اسی گاؤں کی ٹھٹھری ہوئی خاموشی نے
زندگی اپنی بنا دی تھی بہت تلخ و ملول
کل اسی کھیت کا پژمردہ و بے کیف شباب
پیاسی آنکھوں کے لئے گھونٹ تھا انگاروں کا
دیکھ انسان کی فطرت میں تلوّن کا ہجوم
شہرِ خوش رنگ کی شورہ آفریں رونق سے بھی
آج ہم دُور بہت دُور نکل آئے ہیں
پھر بھی پنہاں نظر آتی ہے مجھے راہِ نجات
دیکھ اس چُپ سی فضا میں نہیں اُلجھن کوئی

زندگی ہے بجس و بیکار تگ و دَو ہے یہاں
اور ہم کاہشِ افکار و محن سے مانوس!!
اُٹھ کہ طوفان برسنے کو ہے تاریکی کا
آ چلیں زیست کے ادبار سے پھر جنگ کریں

موضوع

اپنے ابرو کو ذرا یونہی کھنچا رہنے دے
یوں ہی شانوں پہ دوپٹّے کو گرا رہنے دے
دل پہ اِس برہمی کا نقش بٹھانے دے مجھے
ایک شہکارِ مصوّر ہے یہ انداز ترا
خوب ہے تشنۂ تکمیل سا یہ ناز ترا
ذہن پر اپنی یہ تصویر بنانے دے مجھے

ایسے موضوعِ حسیں روز نہیں ہاتھ آتے

نقش یہ چٹکی بجاتے ہی نہیں بن جاتے
یہ وہ قسمت نہیں جو رَہ میں پڑی ملتی ہے
یوں تو ہیں خاک میں بھی سینکڑوں شہکار نہاں
کیا وہ شہکار ہیں ہر ایک کی نظروں میں عیاں
مانگنے سے بھی کوئی چیز کبھی ملتی ہے

روز اندھیرے میں اُجالا تو نہیں ہوتا ہے
گردِ مہ ہر گھڑی ہالا تو نہیں ہوتا ہے
دل کو الہام ہمیشہ تو نہیں ہوتا ہے
جنگ میں فتح بھی ہر بار ضروری تو نہیں
شیطنت کی ہو سدا ہار ضروری تو نہیں
دل سدا وہ تو نہیں کاٹتا جو بوتا ہے

کسے ہر تیرگی میں نور نظر آتا ہے
دل کسے حُسن سے معمور نظر آتا ہے

کتنے ہیں وہ جو ستم کو بھی کرم جانتے ہیں
کون اسرارِ نہفتہ کو عیاں دیکھتا ہے
کون ہر ذرّے کے سینے میں جہاں دیکھتا ہے
کتنے ہیں وہ جو محبّت کو خدا مانتے ہیں

اپنے ابرو کو ذرا یوں ہی کھنچا رہنے دے
یوں ہی شانوں پہ دوپٹے کو گرا رہنے دے
ایسے موضوعِ حسیں روز نہیں ہاتھ آتے
ایک شہکار ہے برہم سا یہ انداز ترا
خوب ہے تشنۂ تکمیل سا یہ ناز ترا
نقش یہ چٹکی بجاتے ہی نہیں بن جاتے

عذر

میرے اخلاق کے دامن پہ کوئی داغ نہیں
میرا کردار ابھی زندہ ہے گو مانتا ہوں
وقت کے ہاتھ کا کچلا ہوا انساں ہوں مَیں
روز اسی وقت اسی رات کی تاریکی میں
کیوں کیا کرتی ہے تُو اپنی رقابت رُسوا
مَیں اگر ویسا ہوں جیسا تو سمجھتی ہے مجھے
تیری آغوشِ حسیں رات کو ٹھنڈی ہی رہے

زیست کے راز کو پڑھنا تو کوئی جرم نہیں
تیرا اور تیری ہی طرّار و حسیں بہنوں کا
بنی آدم کی فضیلت میں بڑا حصّہ ہے
ان کی فطرت سے تعارف تو کوئی عیب نہیں
تُو اسے عیب سمجھتی ہے کوئی شخص اگر
اپنے ارمان کی تسکین کا سامان کرے
میری ان سے یہ ملاقات یہ ملنا، جلنا
تجربہ ہی تو ہے اک ذوقِ تجسس ہی تو ہے
ابھی آسودۂ منزل نہیں میری یہ تلاش
بات یہ ہے کہ حقیقت ہو کہ افسانہ ہو
برق رفتاری سے پڑھنے کا نہیں میں قائل

تُو مجھے اتنے بڑے عیب کا الزام نہ دے
میرا کردار ابھی زندہ ہے گو مانتا ہوں
دوسروں کی طرح حالات کا میں بھی ہوں غلام

زندگی کیا ہے جو مجموعۂ افعال نہیں
اور ہر فعل مرا غیر ارادی ہی تو ہے
مَیں سمجھتا ہوں اسے اپنی بصیرت کا قصور
جس نے ہستی کو محن زار بنا رکھا ہے
تو مجھے اتنے بڑے عیب کا الزام نہ دے
آج بھی تجھ پہ مسلّط ہے جمودِ مذہب
کیا نہیں جانتی مذہب ہی نے انسانوں کو
جعل سازوں کی نگاہوں میں کیا خوار و ذلیل
میرا کردار ابھی زندہ ہے بے داغ بھی ہے
مَیں اگر ویسا ہوں جیسا تو سمجھتی ہے مجھے
تیری آغوشِ حسیں رات کو ٹھنڈی ہی رہے

وقت کی بات

"بھاگے جاتے ہو، ذرا ٹھہرو، مری بات سنو
میری باتوں پہ توجّہ ہی نہیں کرتے ہو
میں یہ کہتی ہوں تمہیں گھر کی ذرا فکر نہیں
تم کبھی اپنے چہیتے کو جھڑکتے ہی نہیں
اتنا لاڈ اچھّا نہیں لڑکا بگڑ جائے گا
کھول کر میرے دوپٹّے کے بندھے پلّو سے
اک دوّنی کی یہ بھر گولیاں لے آیا ہے
چوری اچھّی نہیں تم اس کو ذرا جھڑکو تو"

"ابھی نادان ہے، جانے دو، ابھی بچّہ ہے

وقت آئے گا تو یہ خود ہی سمجھ جائے گا
ایک دن ہم بھی تو اس کی طرح بچے ہی تھے"

"کیا تمہیں اتنی ہی جلدی ہے ذرا بات سنو
آج پھر میں تمہیں آگاہ کیئے دیتی ہوں
ابھی تو وقت ہے بیٹے کو ذرا سمجھاؤ
کوئی اولاد سے اتنا نہیں غافل ہوتا
آج دھوبن کی جگہ اس کی بہو آئی تھی
کپڑے لکھنے جو تمہارا یہ چہیتا بیٹھا
دیر تک اس کی طرف غور سے تکتا ہی رہا
اور دھوبن کی بہو کالی کلوٹی، بُھتنی
دیدہ دانستہ کئی مرتبہ گنتی بھولی
ابھی تو وقت ہے بیٹے کو ذرا سمجھاؤ
کل ہمیں اس کی کہیں شادی بھی کرنا ہوگی
بات کا لوگ بتنگڑ ہی بنا دیتے ہیں"

جانے دو بیٹے کنوارے بھی رہا کرتے ہیں
اس کے پیچھے ہی پڑی رہتی ہو تم تو ہر وقت
یہی کچھ کرتے تھے ہم بھی تو جوانی میں کبھی"

"بھاگے جاتے ہو مری بات سنو گے کہ نہیں،
اچھے ہو آج بھی بچہ ہی سمجھتے ہو اسے
ابتدا ہی سے اسے سر پہ چڑھا رکھا ہے
بہو نے اس کی مجھے آج دئے ہیں طعنے
گھنگیاں ڈال کے منہ میں یہ کھڑا دیکھتا تھا
منع تک اس نے بہو کو نہ کیا، سنتے ہو"

"تم تو ہر روز نیا فتنہ جگا دیتی ہو
ساس سے اپنی یونہی تم بھی لڑا کرتی تھیں
آئے دن کی مجھے اچھی نہیں لگتی چخ چخ"

اخراج

تیری جائے سے بھری آنکھوں میں اشکوں کا ہجوم
درد کے کیفِ جہاں گیر کی ضوتاب دلیل
سنگ پارے بھی ہوئے جس کی تمازت سے گداز
جبر کی مشق بھی غارت گرِ حرماں نہ ہوئی
صبر کے درس سے بھی غم کا تلاطم نہ رُکا
چیر دیتا ہے چٹانوں کو خرامِ دریا

(۲)

غم و آلام ہیں حساس طبیعت کا فساد
شاید انسان کی مٹی کو کوئی حزن پسند
اپنے گرم آنسوؤں میں گوندھ کے خوش ہوتا ہے
جب ہو تخلیق کے اجزا میں خلش اور شرار
دل کبھی تشنۂ جذبات بھی رہ سکتا ہے
دل تمنّاؤں کے عالم کا ادھورا معمار
کبھی بیگانۂ جذبات بھی ہو سکتا ہے
جبر کی مشق چٹانوں کی طرح سخت سہی
لیکن اُمڈا ہوا طوفان کبھی رُکتا ہے

(۳)

یاس کی چاروں طرف انجمن آرائی ہے
بند رہ سکتی ہے یہ چشمِ بصیرت کب تک
ہو ہی جاتی ہیں مظاہر سے نگاہیں مجروح
چُھپ نہیں سکتی تباہی کے بھیڑیوں کی اُڑان

کون ہے ان کی طرف دیکھ کے جو صبر کرے
یہ فراوانیٔ غم۔ حفظِ بقا، جہدِ حیات
جس سے جینے کی، اُبھرنے کی تمنا ہے جو اں
کون سوتا ہے ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے
زندگی کوئی لگن ہو تو بسر ہوتی ہے
اشکِ گلرنگ کا اخراج تو ہے لطفِ سکوں
خوب رو، زور سے رو، شوق سے جی کھول کے رو

اقدام

مَیں نے جلتے ہوئے انفاس سے جُھلسا ہے تجھے
تجھ میں جذبات کو ٹھکرانے کی ہمت ہی نہیں
مَیں نے ہر خواہشِ بیباک سے رَوندا ہے تجھے
تجھ میں فریاد کی، انکار کی جرأت ہی نہیں
جو تمنّائے حصول اور بھی بھڑکاتی ہے
تجھ میں وہ ضد، وہ شرارت، وہ نزاکت ہی نہیں

حُسن جو وقتِ تعمیل کی جاں ہوتا ہے
تجھ میں اس حسنِ دلآویز کی جدّت ہی نہیں

جن کی تکمیل کی اُمید نہیں ہوتی ہے
وہی ناکام تمنّائیں جواں رہتی ہیں
انھی کے خبط سے زندہ ہے تجسّس کی تڑپ
نگہِ شوق سے راہیں جو نہاں رہتی ہیں
جن کا پرتو بھی ہو بازارِ طلب میں معدوم
انھی اجناس کی اقدار گراں رہتی ہیں
حُسن بھی کثرتِ تفریط سے مر جاتا ہے
صورتیں فرطِ تجلّی سے نہاں رہتی ہیں

تجھ پہ عریاں ہی نہیں محنت و کاوش کی نشاط
آنسوؤں سے نہ مجھے روک، مجھے جانے دے
تُو، ترا حسن، ترا جسم تو حاصل ہے مجھے

چیز جو پاس نہیں میرے اُسے لانے دے
راہِ ہستی پہ نہیں گرم روی کے آثار
اس کو پھر شعلۂ اقدام سے گرمانے دے
پھر مجھے تکملۂ شوق و تمنّا کے لئے
دل کو نومیدیٔ جاوید سے تڑپانے دے
تیری خاطر تو تگ و دَو کی ضرورت ہی نہیں
تجھ میں فریاد کی، انکار کی ہمّت ہی نہیں

(کتبہ: مرزا محمد خوشنویس جالندھری)